اپریل ۱۹۶۶ء

جلد ۶۵ عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ہر مسلمان کے لیے قابلِ مطالعہ کتب

محسنِ انسانیت

مؤلف: ابو السلام نعیم صدیقی

- نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر مستند اور جامع کتاب — ایک نئے انداز میں۔
- حضورؐ کی ہمہ گیر شخصیت کا تحریکی نقطۂ نظر سے مطالعہ۔
- پیغمبرانہ بصیرت، تدبر و حکمت کی آئینہ دار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۱۵،۰۰ روپے سستا ایڈیشن ۱۱،۰۰ روپے

حیاتِ طیبہ

از: ابو سلیم محمد عبدالحی

- نبی اکرمؐ کی سیرت پاک آسان اور عام فہم انداز میں۔
- مستند واقعات، ایمان پرور جذبات سے بھرپور۔
- حضورؐ کی قیادت میں برپا شدہ تحریک کا مختصر مگر جامع نقشہ۔
- ایمان و عمل پر ابھارنے والی ایک بیش قیمت کتاب۔

صفحات ۲۸۰ قیمت ۳،۵۰ روپے

ختمِ نبوت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ختم نبوت کے بارے میں ۱۴ صدیوں کے جید علمائے امت کی متفقہ تصریحات۔
- منکرین ختم نبوت کے اعتراضات کا مدلل جواب

آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت

اعلیٰ ایڈیشن خوبصورت سرورق ۶۰ پیسے

سستا ایڈیشن فی نسخہ ۲۰ "

قادیانی مسئلہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اور اس کے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلو

- پاکستان میں قادیانیت کے اثرات۔
- قادیانی عقائد کا دینی، سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے جائزہ
- قادیانیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

قیمت مجلد ۵،۷۵ روپے

سستا ایڈیشن ۳،۷۵ "

مرتد کی سزا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی قانون میں

- اسلامی قانون میں ارتداد کی نوعیت و حیثیت
- اسلام کے ایک اہم قانون کی تشریح مضبوط دلائل کے ساتھ
- مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مسکت و مدلل جوابات

آفسٹ کی حسین طباعت قیمت ایک روپیہ

تجدید و احیائے دین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- تجدید دین کی حقیقت اور اس کی اہمیت
- مجددین ملت کے کارناموں کا تحقیقی مطالعہ
- تجدد اور تجدید کا فرق۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت

قیمت مجلد ۲،۷۵ روپے سستا ایڈیشن ۱،۷۵ روپے

فون = ۲۸۳۴۱

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ○ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ ○ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اپریل ۱۹۶۶ء	جلد ۶۵

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یُوں تو پوری دنیائے اسلام مدتِ دراز سے انحطاط کا شکار ہے لیکن بیس پچیس سال سے اس انحطاط کے جو روح فرسا واقعات سامنے آرہے ہیں وہ اپنے اندر عبرت کے بیشمار پہلُو رکھتے ہیں۔ دُور نہ جائیے صرف پچھلے ایک دو ماہ کے حوادث پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو مسلمانوں کے انتشار اور کس مپرسی کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

افریقہ میں نائجیریا کے شمالی صوبے کے نیک دل اور خدا ترس وزیر اعظم الحاج احمد وبیلو کی مظلومانہ شہادت کے زخم ابھی مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ اخبارات میں گنی کے صدر شیخ طور کی دریا دلی کا تذکرہ شائع ہوا جس کے تحت انہوں نے ایک رُسوائے زمانہ عیسائی آمر کو جس کی اب ساری دلچسپیاں اشتراکیت سے وابستہ ہیں، پُورے ملک کی قسمت طشتری میں رکھ کر نذرانے کے طور پر پیش کر دی اور یہ سخاوت کرتے وقت انہوں نے نہ تو اپنی قوم کو اعتماد میں لینا مناسب سمجھا اور نہ حالات و واقعات پر کوئی نگاہ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ ابھی اس وحشتناک خبر کی سیاہی خشک نہیں ہونے پائی کہ یہ اطلاع سننے میں آئی ہے کہ انڈونیشیا کے مردِ آہنی سکارنو اپنے سارے اختیارات بری فوج کے کمانڈر کو سپرد کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ملک کا پورا نظم ونسق کمانڈر صاحب نے سنبھال لیا ہے۔

اس وقت دنیائے اسلام جس تیزی کے ساتھ زیر و زبر ہو رہی ہے اُسے ایک وقتی اور اتفاقی حادثہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے

سرے تک جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہ ایک زبردست طوفان کی زد میں ہیں اور انہیں کہیں بھی چین اور آرام سے جینا نصیب نہیں ہو رہا۔ یہ اندوہناک صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے دنیائے اسلام پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے۔

ایک مؤرخ نے مسلمانوں کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ قوم جب دنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر اٹھی تو اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے میں تلوار۔ کچھ مدت تک تو اس نے قرآن کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق، قوت و اقتدار کو (جس کی تلوار علامت ہے) بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا لیکن پھر دنیا کی محبت دین پر غالب آگئی اور اُس نے قرآن کو چھوڑ کر دنیاوی مال و متاع سمیٹنا شروع کر دیا۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں تلوار رہ گئی اور دوسرے میں اقتدار کی دولت۔ کچھ مدت تک یہ صورت قائم رہی اور اُس نے تلوار کے بل بوتے پر دنیا کو سرنگوں رکھا مگر کوئی بلند نصب العین سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے بازو جلد ہی شل ہو گئے اور وہ میدان میں تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ اسلام کو تو وہ دنیا کے لالچ میں پہلے ہی خیرباد کہہ چکی تھی اب قوت و طاقت نے بھی جواب دے دیا اور اس طرح یہ زوال کا شکار ہوئی۔

اس مؤرخ کے ذہن میں اسلام کے خلاف جو تعصب ہے غالباً اسی کے زہریلے اثرات کے تحت اُس نے قرآن اور تلوار کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے لیکن اگر اُس کے اِس طرزِ فکر کو نظر انداز کر کے اس کی صحیح صورت سامنے لائی جائے تو مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ہمیں یوں نظر آتی ہے کہ ایک قوم ایک حیات آفریں اور انسانی فلاح و بہبود کے ایک ہمہ گیر اور وسیع تصوّر سے لذت آشنا ہو کر، دنیا کے سینے پر اُبھری۔ اس تصوّر نے اُس کے اندر زندگی کی حرکت اور حرارت پیدا کی، اپنی صلاحیتوں کو تعمیری راہ پر لگانے کا ولولہ بیدار کیا اور اس

کے اندر اس امنگ کو جنم دیا کہ عظمت و حکمت کے جن لازوال سرچشموں سے وہ فیض یاب ہو رہی ہے، اُن سے دوسری قوموں کی کشتِ ویران کو بھی سیراب کرے اور اس نیک اور پاکیزہ مقصد کی راہ میں اگر کوئی باطل قوت حائل ہو اور وہ سیدھے طریق سے راستہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو تو پھر اُسے قوت سے ہٹا دیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے جلیل القدر رفقائے کار نے (اللہ تعالیٰ اُن کی قبروں کو نور سے بھر دے) قوت و اقتدار کو کبھی مطلوب و مقصود نہ ٹھہرایا تھا بلکہ اسے نصب العین کے حصول کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہی قرار دیا۔ ان کا نصب العین بلکہ غایت الغایات ہمیشہ ایک ہی رہی کہ کسی طرح دینِ حق دنیا میں سربلند ہو اور اس کی راہ میں مفاد پرست افراد یا گروہ جو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں انھیں راستہ سے ہٹا دیا جائے یا انسانیت پر اپنی کبریائی قائم کرنے والوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا کر نوعِ بشری کو خدائے برتر کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

بدقسمتی سے یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ مسلمانوں نے قوت و طاقت کے سرچشمے سے مُنہ موڑ لیا اور جاہ و مال اور قوت و اقتدار کو زندگی کا اصل مقصد قرار دے کر زندگی بسر کرنا شروع کی۔ فکر و نظر کی تبدیلی معاشرے کے مختلف طبقات میں مختلف حیثیت سے نمودار ہوئی۔ جو لوگ اقتدار کے رسیا تھے انھوں نے اپنی ساری توجہ اس کے حصول اور حفظ و بقا کے لیے صرف کرنا شروع کر دی۔ انھوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں قوت کا حقیقی سرچشمہ کسی پاکیزہ اور بلند نصب العین کا عشق نہیں بلکہ تخت و تاج کا حصول ہے۔ اسی لیے ان کی اسلام سے وابستگی دن بدن کمزور ہونے لگی اور ساری تگ و دو کا مرکز و محور اقتدار کا حصول بن کر رہ گیا۔ اگر اس اقتدار سے اُن کی غرض اسلام کی سربلندی ہوتی تو وہ دین سے کبھی بھی کسی معاملے میں صرفِ نظر نہ کرتے بلکہ اسے اپنے افکار و اعمال میں زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کرتے تاکہ قوت کے اس اتھاہ خزانے

سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن محض اقتدار کو مقصد ٹھیرانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر چیز کو اسی راہ پر قربان کر دیا۔

اسلام اور مسلم سوسائٹی کو اس غلط اندازِ فکر سے جو متعدد نقصانات پہنچے ہیں، ان میں دو غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ پہلا نقصان جو اسلام اور مسلم سوسائٹی کو پہنچا وہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کی دولت اور ان کے ذرائع و وسائل کی بہت بڑی مقدار جسے اسلام کو حیاتِ انسانی کا اصل مقصد قرار دینے کی صورت میں دینِ حق کی سربلندی کے لیے صرف ہونا چاہیے تھا وہ ایک فرد یا گروہ کے مفادات کی پاسبانی میں بے دریغ صرف ہونے لگی۔ حکمرانوں نے معاشرے کی اصلاح پر توجہ دینے کے بجائے اپنا پورا زور دشمنوں کو نیچا دکھانے پر صرف کر دیا اور وہ خزانہ جو قوم کی امانت تھا اُس پر خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کے گروہ پلنے لگے۔ چنانچہ ایک طرف امت کی دولت برباد ہوئی اور دوسری طرف اس کے اندر ضمیر فروشی کا خوفناک اور تباہ کن مرض سرایت کرنے لگا جس نے بالآخر اس کے اجتماعی اخلاق کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

ماضی پر نگاہ ڈالنے کے بجائے اگر آپ دورِ حاضر کی دنیائے اسلام کا معاشی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ممالک جو کبھی سونا اگلا کرتے تھے اور اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے دنیا میں ممتاز تھے آج افلاس کا شکار ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے کہ ڈیلی ٹیلیگراف میں مصر کی معاشی حالت پر ایک تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں وہاں کے وزیر اعظم ذکریا محی الدین کی زبانی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ملک کی اقتصادی حالت دن بدن دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف زرِ مبادلہ کے ذخائر تشویشناک حد تک کم ہو چکے ہیں اور دوسری طرف قیمتوں میں بڑی سُرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ غیر ملکی تجارت میں حکومت کو ہر سال بیس کروڑ پونڈ کے لگ بھگ خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے آئے دن نئے محصول

عائد کیے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے عوام کی کمر ٹوٹ گئی ہے ۔ غیر ملکی قرضے جن کی مالیت ایک ارب پونڈ تک پہنچ چکی ہے ملک کو استعماری طاقتوں کی جکڑ بندیوں میں بُری طرح جکڑ رہے ہیں ۔

اس اندوہناک صورتِ حال سے صرف مصر ہی دوچار نہیں بیشتر مسلمان ممالک کو قریب قریب اسی قسم کی پریشانی لاحق ہے ۔ اس کی دولت کا زیادہ حصّہ حکمرانوں کی شخصیت کو نمایاں کرنے پر صرف ہو رہا ہے ۔ نشر و اشاعت کے سارے ذرائع ان اصحابِ اقتدار کی مدح سرائی، ان کے کارناموں کو اُچھالنے، اور ان کی غلط پالیسیوں کو صحیح اور برحق ثابت کرنے میں استعمال ہو رہے ہیں اور ان کے ذریعہ قومی تعمیر و ترقی کا جو کام بطریقِ احسن لیا جا سکتا ہے وہ سارا یکسر نظر انداز ہو رہا ہے ۔

تخت و تاج کے حصُول کو حیاتِ انسانی کا بنیادی مقصد قرار دینے کی وجہ سے مسلم سوسائٹی کو دوسرا نقصان یہ پہنچا کہ سوسائٹی کے اُونچے طبقوں میں سازشوں اور باہمی رقابتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ ہر وہ فرد جس نے عزّ و جاہ اور دولت کے اعتبار سے اپنے آپ کو اقتدار کے نسبتاً قریب خیال کیا اُس کے مُنہ میں فوراً پانی آگیا اور اس نے ایک ہی جست میں تخت پر متمکن ہونے کی کوشش کی ۔ دوسری طرف وہ حضرات جو تخت پر پہلے سے قابض تھے انہوں نے ہر وقت فضا میں پھیلے ہوئے مختلف خطرات کو سُونگھنے کی کوشش کی ۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ قوم کا اخلاق بگڑ رہا ہے ۔ انہیں اس چیز کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی کہ لوگوں کی معاشی حالت برباد ہو رہی ہے بلکہ انہیں ہمیشہ ایک ہی فکر دامنگیر رہتی کہ ملک کی سیاسی فضا میں کوئی ایسا تموّج رُونما نہ ہو جو اُن کے لیے کسی وقت بھی خطرے کا باعث بن سکے ۔ اقتدار کے حریفوں کی اس کشمکش میں عوام کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا ۔ وہ بیچارے مفت میں اغراض کے ان بندوں کی حرص و آز

کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ مغلوں کے آخری دور میں محلاتی سازشوں کی وجہ سے ملّت کا شیرازہ جس بُری طرح سے منتشر ہُوا وہ تاریخ کی کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں بلکہ ایسا المناک سانحہ ہے جس کی یاد ابھی تک مسلمانوں کے سینوں سے محو نہیں ہوئی۔ یہ ان سازشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کمزور پڑتی گئی اور مغربی اقوام کو اس پر یلغار کرنے کی شہ ملی۔

ماضی میں تو خیر جو کچھ ہُوا وہ تو ہُوا لیکن حال میں بھی صورتِ حال کسی اعتبار سے اطمینان بخش نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پُوری دنیائے اسلام باہمی سازشوں اور رقابتوں کا ایک اکھاڑہ ہے جس میں ہر شخص ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں مصروف ہے۔ جس فرد کا بس چلتا ہے وہ فوج کی مدد سے عوام کی گردنوں پر ان کی منشا اور مرضی کے علی الرغم مسلط ہو جاتا ہے اور پُوری قوم خواہ اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف کتنی شدید صدائے احتجاج بلند کرتی رہے۔ وہ اقتدار کے تخت کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا بلکہ اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے پر صرف کرتا رہتا ہے۔ اُسے اِس بات کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ وہ عوام کے دلوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرے اس کا سارا وقت عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اپنے مخالفوں کا زور توڑنے میں صرف ہوتا ہے اِس غرض کے لیے ملک کے وسائل اور اس کی انتظامی مشینری بے دریغ استعمال کی جاتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ملکی نظم و نسق کے ذمہ دار اصحاب اپنی اصل ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بجائے اپنی ساری توجہ برسرِ اقتدار گروہ کے تسلّط کو قائم کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اس سے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں زبردست بگاڑ رُونما ہوتا ہے۔ پھر انسانوں کو جب ایک مدت تک آہنی گرفت میں رکھ کر بے بس بنا دیا جائے تو اُن میں اندرونی طور پر اپنے بنیادی حقوق کے بارے میں ایک عام لاپروائی اور ملکی اور ملّی معاملات کے متعلق نفرت اور بیزاری کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی ملک میں

اصل اور فیصلہ کن چیز رائے عامہ نہیں بلکہ اقتدار ہے اور یہ قوتِ قاہرہ اپنی من مانی کارروائیاں کرنے میں یکسر آزاد ہے اور عوام کو اُن کے منشا کے خلاف اپنی دلپسند راہ پر جبر کے ساتھ چلا سکتی ہے اور وہ بیچارے طاقت کی اس اندھی لاٹھی کے اشارے پر حرکت کرنے پر اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں تو اُن کے اندر بالکل فطری طور پر بددلی اور مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ امورِ مملکت کے بارے میں بالکل خاموش تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔ برسرِ اقتدار حضرات عوام کے اس مرض کے تدارک کے لیے قطعاً فکر مند نہیں ہوتے کیونکہ ان کی قوت کا سرچشمہ عوامی تائید نہیں ہوتی بلکہ نوکر شاہی طبقہ ہوتا ہے اس لیے وہ رائے عامہ سے یکسر بے نیاز ہو کر اپنے دل کے ارمان نکالتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ حضرات بروقت ایسی تدابیر سوچتے رہتے ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ عوام کو ملکی معاملات سے زیادہ سے زیادہ بیگانہ اور بے تعلق رکھ سکیں۔

جو لوگ اس تشویشناک صورتِ حال سے متاثر ہو کر مقتدر ہاتھوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں وہ بھی عوام کی مایوسی اور اُن کی بے بسی کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور اس تبدیلی کے لیے کسی آسان فارمولے یا کسی سستے اور زود اثر نسخے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں جسے استعمال کر کے وہ جلد از جلد خاطر خواہ نتائج حاصل کر سکیں۔ عوام کی فلاح، اُن کے اخلاقی اور سیاسی مسائل، اُن کے فکری رجحانات ان حضرات کی توجہ کا کبھی مرکز نہیں بننے پاتے۔ وہ بھی انہیں بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ سمجھتے ہیں جن سے اقتدار پر فائز ہونے کے بعد ہر قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ ان کی پریشانیوں کو صحیح طور سے سمجھنے اور ایک اہلِ دل انسان کی طرح انہیں دُور کرنے کے بجائے ان کے احساسات سے کھیلتے ہیں اور ان کی تربیت کر کے انہیں تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے ان کے جذبات میں مختلف طریقوں سے ہیجان اور اشتعال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک

جذبات کی یہی متلاطم لہریں انہیں ایک ہی ریلے میں ساحلِ مراد پر پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔

آپ کو اگر عوام کی اس بے بسی کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو ماضی کے اوراق اُلٹنے کے بجائے صرف گنی کے حالات پر نگاہ ڈالیں۔ اس سے مسلم ممالک میں عوام کی بے بسی اور بے کسی کی پُوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔ گنی — افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کے شمال میں پرتگالی گنی، جنوب میں لائبیریا اور سیرالیون، مشرق میں جمہوریہ مالی اور آئیوری کوسٹ اور مغرب میں بحر اوقیانوس واقع ہے گنی میں دوتہائی اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہے۔ پھر اس کے اردگرد جتنے ممالک ہیں ان میں بھی صرف لائبیریا کو چھوڑ کر مسلمانوں کی آبادی غیر مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً مالی میں ۸۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح سرالیون، گینیا (پرتگالی)، اور آیوری کوسٹ میں بھی مسلمانوں کا تناسب ۶۶ فیصد سے کسی طرح کم نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس خدشہ کا اظہار بھی قطعاً بے بنیاد ہے کہ گنی چونکہ غیر مسلم طاقتوں کے درمیان گھرا ہُوا تھا اس لیے اس کا فرمانروا انکرومہ جیسے آمر کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور ہُوا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر جب ہم گھانا اور گنی کے معاشرتی اور تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہم کوئی قدرِ مشترک نہیں پاتے۔ گھانا انگریزی استعمار کے قبضے میں رہا اور اس بنا پر وہاں انگریزی کا دَور دورہ ہے۔ گنی نے فرانس کے تسلط سے نجات حاصل کی تب اور اس وجہ سے یہاں فرانسیسی زبان کو بالادستی حاصل ہے۔

پھر گھانا کے اس آمر نکرومہ میں بھی کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیت نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر گنی میں اس کا وجود کسی خیر و برکت کا موجب ثابت ہو سکتا ہو۔ اس نے گھانا میں عوام پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے، اُن کے جذبۂ آزادی اور حُریت کو جس بیدردی کے ساتھ پامال

کیا اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کو اپنی عیاشیوں میں جس طریق سے صرف کیا اُس کی کسی ایسے شخص سے توقع نہیں کی جاسکتی جسے انسانی بنیادی اخلاق کا ذرّہ برابر بھی پاس ہو۔ یہ شخص خود پرستی کے مرض میں خطرناک حد تک مبتلا تھا۔ اسے ہمیشہ ایک ہی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح لوگوں کو اپنی ذات کی غیر مشروط اطاعت اور غلامی کے لیے ذہنی اور جذباتی طور پر تیار کیا جائے۔ اس غرض کے لیے اس نے بڑے ہی ناجائز حربے استعمال کیے۔ جس جس شخص کے بارے میں بھی اُسے اپنی مخالفت کا شبہ ہوا اسے جیل میں ڈال دیا۔ ایک سنسرشپ بل کے ذریعہ اُن تمام اخبارات کو بند کروا دیا جو اس کی تعریف و توصیف میں ذرا بھی متامل تھے۔ اس کے اس مطلق العنان رویے سے ملک کی سب سے اونچی عدالت بھی محفوظ نہ تھی۔ ۱۹۶۳ء میں اس نے چیف جسٹس کو صرف اس لیے برطرف کر دیا کہ اس نے حکومت سے اختلاف کرنے والے تین رہنماؤں کو بے گناہ پاکر قید سے رہائی کے احکام صادر کیے۔ بعد ازاں اس سرپھرے آمر نے یہ اختیار بھی حاصل کر لیا کہ وہ قومی مفاد کے پیشِ نظر عدالتی احکام کو بھی منسوخ کر سکتا ہے چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۴ء میں اس نے سپریم کورٹ کے تین ججوں کو کوئی وجہ بتائے بغیر برطرف کر دیا۔

اس شخص کی شاہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے چند سال پیشتر ملک کی عنانِ اقتدار سنبھالی تو اُس وقت سرکاری خزانے میں پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر تھے اور اب اسے معزول کرنے کے بعد جب ملک کی مالی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت یہ بدنصیب ملک ایک سو کروڑ ڈالر کا مقروض ہے۔ یہ روپیہ کہاں صرف ہوتا تھا اس کی جو تفصیلات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن سے اس آمر کی ملک دوستی کی نہایت گھناؤنی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس شخص نے عکرہ میں ایک کروڑ پونڈ کی لاگت سے ایک بم پروف ہال تعمیر کروایا۔ اس کے ذاتی اخراجات پر کتنا روپیہ خرچ ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تازہ دورۂ چین پر روانہ ہوتے ہوئے یہ شخص پینتالیس ہزار پاؤنڈ کا زرِمبادلہ

سرکاری خزانہ سے اٹھا کرلے گیا۔اس سلسلہ میں یہ چیز پوری طرح ذہن نشین رہے کہ یہ خطیر رقم اُس کی بالکل ذاتی اور خانگی ضروریات پر خرچ ہوئی تھی کیونکہ اس کا سارا سفر خرچ اس رقم سے الگ سرکاری خزانے سے ادا ہونا تھا۔

یہ شخص انتہائی عیاش ہے اور اپنی عیاشیوں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔اس نے اپنی ایک داشتہ کو ٹیلیویژن پروگراموں کی افسرِ اعلیٰ مقرر کر رکھا تھا اور اسے ایک اعلیٰ درجہ کی ایرکنڈیشنڈ امریکی کار دے کر دی جو عیاشی اور تفریح کے لیے استعمال ہوتی رہتی تھی۔

لوگوں کی بہو بیٹیوں کی عفت اور عصمت کو برباد کرنے کے لیے اس آمر کی ہدایت کے مطابق منصوبے تیار ہوتے اور اس کی شہ پر سرکاری غنڈے عوام کی عزت پر بلاخوف وخطر ہاتھ ڈالتے۔وہ لوگ جنہوں نے سرکاری عہدوں کے حصول اور حکمران کے تقرب کے لیے اپنی غیرت کا خود گلا گھونٹ دیا وہ تو اسی رُخ پر بہ نکلے جس رُخ پر کہ بداخلاقی کا یہ طوفان انہیں بہا کر لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ حضرات جن کے نزدیک عزت وعفت کی کوئی قدر نہ قیمت تھی اور وہ اخلاقی اقدار کو قومی زندگی میں کوئی اہمیت دیتے تھے ان کے لیے یہ باتیں سخت ناقابلِ برداشت تھیں۔چنانچہ اس آمر کے عہدِ حکومت میں بےشمار ذہین لوگ ملک چھوڑ کر انگلستان اور دوسرے علاقوں میں چلے گئے اور بہت سے فوجی اور سول حکام نے اپنی ملازمتوں کو خیرباد کہہ دیا۔

ایک طرف قوم کے اخلاق اور اس کے ضمیر کا دیوالیہ نکل رہا تھا اور زندگی عوام پر ایک عذاب بن کر مسلط ہو رہی تھی لیکن دوسری طرف حکومت عوام کو برابر یہ باور کرانے میں مصروف تھی کہ ان کا اقبال ترقی پر ہے اور نکروما اُن کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتا ہے۔اپنی شخصیت کی برتری کا مصنوعی نقش لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لیے گھانا کی ڈاک کے ٹکٹوں پر اور ملکی سکوں پر اس آمر کی تصاویر نمایاں ہوتیں،جگہ جگہ اُس کے مجسمے نصب کیے جاتے اور بجلی کے قمقموں کی مدد سے لاکھوں روپے کے صرف کے ساتھ اس کا نام شاہراہوں اور بڑی عمارتوں

پر حگمگانے کا انتظام کیا جاتا ۔ نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں اُس کے متعلق بڑے ہی باطل تصورات کے نقوش ثبت کیے جاتے ۔ چنانچہ یہ معصوم بچے سب صبح خدا اور یسوع مسیحؑ کی حمد و ثنا کا گیت گاتے تو ان دو مقدس ناموں کے ساتھ نکرومہ کا نام بھی شامل کرنے پر مجبور ہوتے ۔

جس شخص کا طرزِ فکر اتنا ملحدانہ ، جس کا مزاج اتنا آمرانہ اور جس کا طرزِ عمل خود اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اتنا ظالمانہ بلکہ سفاکانہ رہا ہو اُسے ایک شخص ایک ایسی مملکت کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیتا ہے جس کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام پر ایمان رکھتی ہے ۔ پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ مسلمان سپاہ کو اس ظالم کے چھنے ہوئے اقتدار کو اسے واپس دلانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے ۔ بھیڑ بکریوں کے گلے کو بھی کسی سمت ہانکتے ہوئے چرواہا اس بات پر غور کرتا ہے کہ کیا جس طرف وہ اس گلے کو لے جانے کا عزم کر رہا ہے وہاں مہیب غار تو نہیں پائے جاتے جہاں ان جانوروں کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو ۔ کیا وہاں درندے تو موجود نہیں جن سے ان کی زندگی کی حفاظت ناممکن ہو ، کیا وہاں گھاس اور پانی مہیا ہو سکتا ہے ۔ ایک چرواہا اپنے گلے کو جنگل میں لے کر نکلنے سے پہلے اس نوعیت کی بہت سی باتیں سوچتا ہے اور پھر کہیں کوئی قدم اٹھاتا ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن حکمرانوں کو مسلمان ممالک اور مسلم قوم کی سربراہی کا منصب حاصل ہو جاتا ہے انہیں اپنے دینی بھائیوں سے اتنی بھی ہمدردی نہیں ہوتی جتنی کہ ایک چرواہے کو بھیڑوں کے گلے سے ہوتی ہے ۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی طرح جس طرح چاہتے ہیں انسانوں کی قسمت سے کھیلتے ہیں اور کوئی بڑے سے بڑا قدم اٹھاتے ہوئے قطعاً نہیں سوچتے کہ اس کے نتائج ملک و ملت اور خود اُن کے لیے کتنے تباہ کن ہونگے ۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں پوری قوم کی قسمت کا بلا تکلف سودا کر لیتے ہیں ۔ ایک آدمی اپنے مکان کا فرنیچر کسی دوسرے

ﮯ نکرومہ صاحب کی ان ساری کارروائیوں کی تفصیل پاکستان کے اخبارات سے حاصل کی گئی ہے مثلاً جنگ ، نوائے وقت ، کوہستان ، مشرق اور پاکستان ٹائمز ۔

مکان میں منتقل کرتے ہوئے یہ سوچتا ہے کہ کیا یہ مکان اس فرنیچر کے لیے موزوں بھی ہے۔ لیکن شیخ طور صاحب نے نکرومہ کو ملک کی باگ ڈور دیتے ہوئے اتنا بھی غور نہیں کیا۔

مطلق العنان ذہنیت رکھنے والے حکمرانوں کے آمرانہ فیصلوں کے جواز میں بعض لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ عوام کو کیا معلوم کہ ان حضرات کو کس قسم کی مجبوریاں لاحق ہوتی ہیں۔ لیکن یہ دلیل بڑی بودی اور کمزور ہے۔ وہ عوام جو حکمرانوں کے اللوں تللوں کے لیے روپیہ مہیا کرتے ہیں، جو اُن کی ہر مصیبت اور پریشانی میں ساری تلخیاں بھلا کر اُن کا ساتھ دیتے ہیں، جو اُن کے اشارے پر اپنی جانوں تک کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جن کی ان تھک محنت، جن کے مخلصانہ تعاون، جن کے جذبۂ ایثار اور اطاعت کیشی پر ملک کے حفظ و بقا اور اس کی ترقی کا سارا دارو مدار ہوتا ہے، انہیں کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھاتے وقت یکسر نظر انداز کر دینا نہ صرف بہت بڑی عاقبت نا اندیشی ہے بلکہ احسان فراموشی بھی ہے۔ جن لوگوں کے وجود سے کسی مملکت کا وجود قائم ہوتا ہے، جن کا اتفاق و اتحاد مملکت کی سالمیت کا ضامن ہوتا ہے، جن کا خون پسینہ اس کی تعمیر و ترقی میں گارے کا کام دیتا ہے، انہیں، ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہوئے نظر انداز کر دینا اور ان کی پسند اور ناپسند کو کوئی اہمیت نہ دینا کسی لحاظ سے بھی دیانتدارانہ روش نہیں کہی جا سکتی۔ جب فیصلہ عوام کی قسمت کا ہو رہا ہو تو سب سے پہلے انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ان پر کیا بیتنے والی ہے۔

مملکت کی سربراہی کوئی نجی کاروبار نہیں جس کے تجارتی راز افشا ہونے سے منافعوں کی اجارہ داری کو نقصان کا خطرہ لاحق ہو۔ یہ ایک ایسا فرض ہے کہ اس میں جب تک ہر فرد پورے خلوص، احساس ذمہ داری اور خوش دلی کے ساتھ شریک نہ ہو اس وقت تک یہ بخوبی سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس بنا پر اس میں عوام کی خوشدلانہ شرکت انتہائی ضروری ہے۔ اور جو لوگ

اس کے بغیر امورِ مملکت کو چلانے کا ارادہ کرتے ہیں اُن کے سامنے جلد ہی اپنی اس حماقت کے سنگین نتائج نہایت واضح طور پر آجاتے ہیں۔ جن سربراہوں نے بھی عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اور انہیں سلطنت کے معاملات میں شریک کیے بغیر کوئی اقدام کرنا چاہا، انہیں نہ صرف خود شدید ناکامی سے دوچار ہونا پڑا بلکہ قوم اور ملک کو بھی اُن کی اس غلطی کی پاداش میں نہایت بُرے دن دیکھنے پڑے۔ اس آمرانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی ہٹلر اور مسولینی سے بہتر کون ترجمانی کرسکتا ہے اور ان سے زیادہ اپنے عزائم اور ارادوں میں کون مخلص ہوسکتا ہے لیکن ان کے اخلاص، جذبۂ ایثار، ان کی غیر معمولی جرأت اور بہادری کے باوجود اُن کا اور خود اُن کی قوموں کا جو حشر ہُوا ہے وہ بڑا حسرتناک ہے۔ یہی انجام ماضی قریب میں شاہ فاروق اور چین کے چیانگ کائی شیک کا ہو چکا ہے۔ اور اب گھانا کے نکرومہ اسی انجام کو پہنچے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود آخر تاریخ نے اُن کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ ان سب نے قومی امنگوں اور ارادوں کو یکسر نظر انداز کرکے قوم کی قسمت سے کھیلنے کی ناپاک سعی کی اس لیے یہ سارے ایک ہی انجام کو پہنچے۔ انہوں نے قوم کو اعتماد میں لینے کے بجائے پولیس اور فوج کی قوت پر اعتماد کیا اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے انہیں اندھے بہرے قوانین کی جکڑبندیوں میں جکڑ کر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عوام کے دل و دماغ میں نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہُوا اور انہوں نے اپنے ان "کرم فرماؤں" سے جلد ہی نجات حاصل کرنے کی سعی کی۔ کسی آمرِ مطلق کا اس سے زیادہ حسرتناک انجام اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو بچے ہر صبح اُس کی تعریف و توصیف میں ترانے گائیں، اُس کے حق میں "عظیم مسیحا" کے نعرے بلند کریں، جگہ جگہ اُس کے نصب کیے ہوئے بتوں کو سلامی دیں، وہ اس کے اقتدار سے محروم ہونے کے ساتھ ہی اس کے بتوں کو روندنا شروع کردیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ جبر سے جھکی ہوئی گردنیں، ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتی ہیں۔ اور جب انہیں ذرا سا موقع بھی ملتا ہے تو فوراً جبر سے نجات حاصل کرنے کے

لیے جد وجہد کرنے لگتی ہیں۔ اس جد وجہد میں توازن نہیں ہوتا بلکہ برسوں کے گھٹے ہوئے جذبات جوش کو ہوش پر غالب کر دیتے ہیں اور وہ عوام اپنی آزادی کا قرض مع سود چکاتے ہیں۔

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" ایک غیر انسانی نظریہ ہے۔ یہ اُس غلط ذہنیت کا آئینہ دار ہے جس کے تحت فرمانروا یہ سمجھ کر عنانِ اقتدار سنبھالتا ہے کہ سلطنت اس کی ذاتی ملکیت ہے اور وہ اس بات کا پورا پورا حق رکھتا ہے کہ اُس کے ذرائع و وسائل کو ذاتی مفادات کے لیے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ وہ بلاشرکت غیرے پوری قوم کا مالک ہے۔ کوئی فرد اُس سے اُس کے کسی طرزِ عمل کے بارے میں بازپرس نہیں کر سکتا وہ اپنی قلمرو کے اندر جو چاہے کرے، جسے چاہے زندہ رہنے دے اور جسے چاہے زندگی کے حق سے محروم کر دے۔ اُس سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ غیر مسئول اقتدار کا مالک ہے۔ وہ اپنی سلطنت کے حدود کے اندر خدائی اختیارات رکھتا ہے۔ اس کی کبریائی کے سامنے کوئی لب کشائی کی جراٴت نہیں کر سکتا۔ اُس کا دماغ ہر دوسرے دماغ سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اتنا ارفع کہ اُس میں کوئی غلط چیز کبھی راہ نہیں پا سکتی۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر خطا سے منزّہ اور ہر خامی سے عاری ہے۔ اس کی نگاہیں بڑی دُور رس ہوتی ہیں۔ اس بنا پر عوام بیچارے اُس کی سوچی ہوئی مصلحتوں کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی فلاح کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ امورِ مملکت کی ذمّہ داری فرمانرواؤں پر ڈال کر ملکی معاملات سے بالکل بے تعلق ہو جائیں اور اقتدار کے تخت سے انہیں جو احکام صادر ہوں انہیں نہ صرف بلا چون وچرا قبول کریں بلکہ پورے جذبہ و شوق کے ساتھ انہیں بجا لائیں۔ اُن کی عافیت اسی میں ہے کہ ان خداؤں کی اقلیم میں تسلیم و رضا کے پیکر بن کر زندہ رہیں۔

یہ وہ طرزِ فکر ہے جسے انسان نے کبھی صدق دل سے قبول نہیں کیا اور جسے ختم کرنے کے لیے انسانیت کے بڑے بڑے ہادیوں، رہنماؤں اور محسنوں نے بھرپور کوشش کی ہے۔ صدیوں کے تجربات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے۔ دنیا میں جس شخص یا گروہ نے اس نظریہ کو اپنانے کا ناپاک عزم کیا اُس کا وہی حشر ہُوا جو انسانیت کے بہی خواہوں کے ہاتھوں اس نظریہ کے علمبردار خسرو پرویز کا آج سے کئی سو سال پہلے ہُوا تھا۔

اس باطل نظریے اور غیر انسانی طرزِ فکر کے خلاف انسانیت کی بغاوت کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ انسان جب تک انسان ہے وہ رضا و رغبت کے ساتھ نہ تو اپنے انسانی حقوق چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی دوسرے انسان کو وہ بلند و بالا مقام دینے پر تیار ہو سکتا ہے جس پر فائز ہو کر وہ اپنے جیسے انسانوں میں اپنی کبریائی کا سکہ چلاتے۔ اپنے انسانی حقوق کا غیر معمولی احترام اور انسان کی خدائی سے بغاوت، یہ دونوں باتیں اُس کی فطرت میں شامل ہیں۔ اس نے وقتی مجبوریوں کے تحت بگڑے ہوئے انسانوں کے اس غلط طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو بلاشبہ کبھی کبھی گوارا کیا لیکن اس کی فطرتِ سلیم ہمیشہ اُسے اُن کے خلاف سرگرمِ عمل کرتی رہی اور جب کبھی اُسے ان سے نجات کی راہ نظر آتی تو فوراً اس پر گامزن ہونے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے ان جھوٹے خداؤں سے ستائی ہوئی انسانیت نے اُس پر لبیک کہا۔ کیونکہ ان مقدس نفوس کی عافیت میں آنے سے انہیں انسان کی غلامی سے گلو خلاصی اور اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کے ملنے کی توقع تھی

تفہیم القرآن

الحُجُرات

نام | آیت ۴ کے فقرہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ سے ماخوذ ہے مُراد یہ ہے کہ وہ سُورۃ جس میں لفظ الحجرات آیا ہے۔

زمانۂ نزول | یہ بات روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے اور سورۃ کے مضامین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ سورۃ مختلف مواقع پر نازل شدہ احکام و ہدایات کا مجموعہ ہے جنہیں مضمون کی مناسبت سے یک جا کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر احکام مدینۂ طیبہ کے آخری دَور میں نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً آیت ۴ کے متعلق مفسرین کا بیان ہے کہ یہ بنی تمیم کے بارے میں نازل ہوئی تھی جن کے وفد نے آکر ازواجِ مطہرات کے حجروں کے باہر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا شروع کر دیا تھا، اور تمام کتبِ سیرت میں اس وفد کی آمد کا زمانہ ۹ھ ہجری بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ۶ کے متعلق حدیث کی بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ولید بن عُقبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق سے زکوٰۃ وصول کر کے لانے کے لیے بھیجا تھا، اور یہ بات معلوم ہے کہ ولید بن عقبہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے ہیں۔

موضوع اور مباحث | اس سورہ کا موضوع مسلمانوں کو اُن آداب کی تعلیم دینا ہے جو اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے پانچ آیتوں میں اُن کو وہ ادب سکھایا گیا ہے جو انہیں اللہ اور اس کے رسول کے معاملہ میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

پھر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ہر خبر پر یقین کر لینا اور اس پر کوئی کارروائی کر گزرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی اطلاع ملے تو غور سے دیکھنا چاہیے کہ خبر ملنے کا ذریعہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ قابلِ اعتماد نہ ہو تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے تحقیق کر لینا چاہیے کہ خبر صحیح ہے یا نہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

پھر مسلمانوں کو اُن برائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، ایک دوسرے کے بُرے بُرے نام رکھنا، بدگمانیاں کرنا، دوسروں کے حالات کی کھوج کُرید کرنا، لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی بُرائیاں کرنا، یہ وہ افعال ہیں جو بجائے خود بھی گناہ ہیں اور معاشرے میں بگاڑ بھی پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نام بنام ان کا ذکر فرما کر انہیں حرام قرار دیا ہے۔

اس کے بعد اُن قومی اور نسلی امتیازات پر ضرب لگائی گئی ہے جو دنیا میں عالمگیر فساد کے موجب ہوتے ہیں۔ قوموں اور قبیلوں اور خاندانوں کا اپنے شرف پر فخر و غرور اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنا، اور اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے دوسروں کو گرانا، ان اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت دنیا ظلم سے بھر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر سی آیت میں یہ فرما کر اس بُرائی کی جڑ کاٹ دی ہے کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے ہیں اور قوموں اور قبیلوں میں اُن کا تقسیم ہونا تعارف کے لیے ہے نہ کہ تفاخر کے لیے، اور ایک انسان پر دوسرے انسان کی فوقیت کے

لیے اخلاقی فضیلت کے سوا اور کوئی جائز بنیاد نہیں ہے۔

آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اصل چیز ایمان کا زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو ماننا، عملاً فرمانبردار بن کر رہنا، اور خلوص کے ساتھ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کھپا دینا ہے۔ حقیقی مومن وہی ہیں جو یہ روش اختیار کریں۔ رہے وہ لوگ جو دل کی تصدیق کے بغیر محض زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں اور پھر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا اسلام قبول کر کے انہوں نے کوئی احسان کیا ہے، تو دنیا میں ان کا شمار مسلمانوں میں ہو سکتا ہے، معاشرے میں ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اللہ کے ہاں وہ مومن قرار نہیں پا سکتے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اَے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو[1] اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[2]۔

---

[1] یہ ایمان کا اوّلین اور بنیادی تقاضا ہے۔ جو شخص اللہ کو اپنا رب اور اللہ کے رسول کو اپنا ہادی و رہبر مانتا ہو، وہ اگر اپنے اِس عقیدے میں سچا ہے تو اس کا یہ رویّہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اپنی رائے اور خیال کو اللہ اور رسول کے فیصلے پر مقدم رکھے یا معاملات میں آزادانہ رائے قائم کرے اور اُن کے فیصلے بطورِ خود کر ڈالے بغیر اس کے کہ اسے یہ معلوم کرنے کی فکر ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان معاملات میں کوئی ہدایت دی ہے یا نہیں اور دی ہے تو وہ کیا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے کہ اَے ایمان لانے والو، اللہ اور اس کے رسول کے آگے "پیش قدمی نہ کرو"، یعنی ان سے آگے بڑھ کر نہ چلو، پیچھے چلو۔ مقدم نہ بنو، تابع بن کر رہو۔ یہ ارشاد اپنے حکم میں سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ سے ایک قدم آگے ہے۔ اُس میں فرمایا گیا تھا کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو اس کے بارے میں کسی مومن کو خود کوئی الگ فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اور اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنے معاملات میں پیش قدمی کر کے بطورِ خود فیصلے نہیں کر لینے چاہییں بلکہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنّت میں ان کے متعلق کیا ہدایات ملتی ہیں۔

یہ حکم مسلمانوں کے محض انفرادی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے جملہ اجتماعی معاملات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ اسلامی آئین کی بنیادی دفعہ ہے جس کی پابندی سے نہ مسلمانوں کی حکومت آزاد ہو سکتی ہے، نہ ان کی عدالت اور نہ پارلیمنٹ۔ مُسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ ماجہ میں یہ روایت صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت مُعاذ بن جبل کو یمن کا حاکمِ عدالت بنا کر بھیج رہے تھے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ "تم کس چیز سے فیصلے کرو گے؟" انہوں نے عرض کیا "کتاب اللہ کے مطابق"۔ آپؐ نے پوچھا "اگر کتاب اللہ میں کسی معاملے کا حکم نہ ملے تو کس چیز کی طرف رجوع کرو گے؟" انہوں نے کہا "سنّتِ رسول اللہ کی طرف"۔ آپؐ نے فرمایا "اگر اس میں بھی کچھ نہ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو[۳] کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو[۴]۔ جو لوگ رسولِ خدا کے حضور

ملے ؟" انہوں نے عرض کیا " پھر میں خود اجتہاد کروں گا " اس پر حضورؐ نے اُن کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے "۔ یہ اپنے اجتہاد پر کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ کو مقدم رکھنا اور ہدایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اُن کی طرف رجوع کرنا ہی وہ چیز ہے جو ایک مسلمان جج اور ایک غیر مسلم جج کے درمیان وجہِ امتیاز ہے ۔ اسی طرح قانون سازی کے معاملہ میں یہ بات قطعی طور پر متفق علیہ ہے کہ اولین ماخذِ قانون خدا کی کتاب ہے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ۔ پوری امت کا اجماع تک ان دونوں کے خلاف یا ان سے آزاد نہیں ہو سکتا کجا کہ افرادِ امت کا قیاس و اجتہاد۔

[۲] یعنی اگر کبھی تم نے اللہ اور اس کے رسول سے بے نیاز ہو کر خود مختاری کی روش اختیار کی یا اپنی رائے اور خیال کو ان کے حکم پر مقدم رکھا تو جان رکھو کہ تمہارا سابقہ اس خدا سے ہے جو تمہاری سب باتیں سُن رہا ہے اور تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے ۔

[۳] یہ وہ ادب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو سکھایا گیا تھا ۔ اس کا منشا یہ تھا کہ حضورؐ کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہلِ ایمان آپ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں ۔ کسی شخص کی آواز آپ کی آواز سے بلند تر نہ ہو ۔ آپ سے خطاب کرتے ہوئے لوگ یہ بھول نہ جائیں کہ وہ کسی عام آدمی یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول سے مخاطب ہیں ۔ اس لیے عام آدمیوں کے ساتھ گفتگو اور آپ کے ساتھ گفتگو میں نمایاں فرق ہونا چاہیے اور کسی کو آپ سے اُونچی آواز میں کلام نہ کرنا چاہیے ۔

یہ ادب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لیے سکھایا گیا تھا اور اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو حضورؐ کے زمانے میں موجود تھے ، مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر یہی ادب ملحوظ رکھنا

بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے[۵]، ان کے لیے مغفرت ہے اور اجرِ عظیم۔

اَے نبی، جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا[۶]، اللہ درگزر کرنے والا اور

چاہیے جب آپ کا ذکر ہو رہا ہو، یا آپ کا کوئی حکم سنایا جائے، یا آپ کی احادیث بیان کی جائیں۔ اس کے علاوہ اس آیت سے یہ ایماء بھی نکلتا ہے کہ لوگوں کو اپنے سے بزرگ تر اشخاص کے ساتھ گفتگو میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کا اپنے بزرگوں کے سامنے اُس طرح بولنا جس طرح وہ اپنے دوستوں یا عام آدمیوں کے سامنے بولتا ہے، دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں ان کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے اور وہ ان میں اور عام آدمیوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔

[۴] اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ذاتِ رسولؐ کی عظمت کا کیا مقام ہے۔ رسولِ پاکؐ کے سوا کوئی شخص، خواہ بجائے خود کتنا ہی قابلِ احترام ہو، بہرحال یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اس کے ساتھ بے ادبی خدا کے ہاں اُس سزا کی مستحق ہو جو حقیقت میں کفر کی سزا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک بدتمیزی ہے، خلافِ تہذیب حرکت ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں ذرا سی کمی بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ آپ کا احترام دراصل اُس خدا کا احترام ہے جس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ کے احترام میں کمی کے معنی خدا کے احترام میں کمی کے ہیں۔

[۵] یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں اور ان آزمائشوں سے گزر کر جنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے دلوں میں فی الواقع تقویٰ موجود ہے وہی لوگ اللہ کے رسول کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس ارشاد سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جو دل رسول کے احترام سے خالی ہے وہ درحقیقت تقویٰ سے خالی ہے اور رسول کے مقابلے میں کسی کی آواز کا بلند ہونا محض ایک ظاہری بدتہذیبی نہیں ہے، بلکہ باطن میں تقویٰ نہ ہونے کی علامت ہے۔

رحیم ہے۔

۳؎ حضورؐ کے عہد مبارک میں جن لوگوں نے آپ کی صحبت میں رہ کر اسلامی آداب و تہذیب کی تربیت پائی تھی وہ تو آپ کے اوقات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ ان کو پُورا احساس تھا کہ آپ اللہ کے کام میں کس قدر مصروف زندگی بسر فرماتے ہیں، اور ان تھکا دینے والی مصروفیتوں کے دوران میں لازماً کچھ وقت آپ کے آرام کے لیے اور کچھ وقت آپ کی اہم مشغولیتوں کے لیے اور کچھ وقت اپنی خانگی زندگی کے معاملات کی طرف توجہ کرنے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ آپ سے ملاقات کے لیے اُسی وقت حاضر ہوتے تھے جب آپ باہر تشریف فرما ہوں، اور اگر کبھی وہ آپ کو مجلس میں موجود نہ پاتے تو بیٹھ کر آپ کے برآمد ہونے کا انتظار کرتے تھے اور کسی شدید ضرورت کے بغیر آپ کو باہر تشریف لانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ لیکن عرب کے اُس ماحول میں، جہاں عام طور پر لوگوں کو کسی شائستگی کی تربیت نہ ملی تھی، بارہا ایسے اَن گھڑ لوگ بھی آپ سے ملاقات کے لیے آجاتے تھے جن کا تصوّر یہ تھا کہ دعوت الی اللہ اور اصلاحِ خلق کا کام کرنے والے کو کسی وقت بھی آرام لینے کا حق نہیں ہے، اور انہیں حق ہے کہ رات دن میں جب چاہیں اس کے پاس آدھمکیں اور اس کا فرض ہے کہ جب بھی وہ آجائیں وہ اُن سے ملنے کے لیے مستعد رہے۔ اس قماش کے لوگوں میں عموماً اور اطرافِ عرب سے آنے والوں میں خصوصاً بعض ایسے ناشائستہ لوگ بھی ہوتے تھے جو آپ سے ملاقات کے لیے آتے تو کسی خادم سے اندر اطلاع کرانے کی زحمت بھی نہ اٹھاتے تھے بلکہ ازواجِ مطہرات کے حجروں کا چکر کاٹ کر باہر ہی سے آپؐ کو پکارتے پھرتے تھے۔ اس طرح کے متعدد واقعات احادیث میں صحابۂ کرام نے روایت کیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ان حرکات سے سخت تکلیف ہوتی تھی مگر اپنے طبعی حلم کی وجہ سے آپ اسے برداشت کیے جارہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں مداخلت فرمائی اور اس ناشائستہ طرزِ عمل پر ملامت کرتے ہوئے لوگوں کو یہ ہدایت دی کہ جب وہ آپ سے ملنے کے لیے آئیں اور آپ کو موجود نہ پائیں تو پکار پکار کر آپ کو بلانے کے بجائے صبر کے ساتھ بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کریں جب آپ خود ان سے ملاقات کے لیے باہر تشریف لائیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

ے یعنی اب تک جو کچھ ہوا سو ہوا، آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ پچھلی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا اور اپنے رحم و کرم کی بنا پر ان لوگوں سے کوئی مواخذہ نہ کرے گا جو اُس کے رسول کو اس طرح اذیت دیتے رہے ہیں۔

ش اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عُقبہ بن ابی مُعیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ بنی المُصْطَلِق جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عُقبہ کو بھیجا تاکہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لائیں۔ یہ اُن کے علاقے میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہلِ قبیلہ سے ملے بغیر مدینہ واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ یہ خبر سُن کر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک دستہ روانہ کریں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے وہ دستہ روانہ کر دیا تھا اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ روانہ کرنے والے تھے۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار (ام المومنین حضرت جُوَیریہ کے والد) اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور انہوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں کجا کہ زکوٰۃ دینے سے انکار اور ان کے قتل کے ارادے کا کوئی سوال پیدا ہو، ہم ایمان پر قائم ہیں اور ادائے زکوٰۃ سے ہرگز انکاری نہیں ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس قصے کو امام احمد، ابن ابی حاتم، طَبَرانی اور ابنِ جریر نے حضرات عبداللہ بن عباس، حارث بن ضرار، مجاہد، قَتادہ، عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ، یزید بن رومان، ضحاک اور مُقاتِل بن حیان سے نقل کیا ہے۔ حضرت امّ سَلَمہ کی روایت میں یہ پورا قصہ بیان تو اسی طرح ہوا ہے مگر اس میں ولید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔

اس نازک موقع پر جبکہ ایک بے بنیاد خبر پر اعتماد کر لینے کی وجہ سے ایک عظیم غلطی ہوتے ہوتے

خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت

رہ گئی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اصولی ہدایت دی کہ جب کوئی اہمیت رکھنے والی خبر، جس پر کوئی بڑا نتیجہ مترتب ہوتا ہو، تمہیں ملے تو اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ اگر وہ کوئی فاسق شخص ہو، یعنی جس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ اس کی بات اعتماد کے لائق نہیں ہے، تو اس کی دی ہوئی خبر پر عمل کرنے سے پہلے تحقیق کر لو کہ امرِ واقعہ کیا ہے۔ اس حکمِ ربانی سے ایک اہم شرعی قاعدہ نکلتا ہے جس کا دائرۂ اطلاق بہت وسیع ہے۔ اس کی رُو سے مسلمانوں کی حکومت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی کارروائی ایسے مخبروں کی دی ہوئی خبروں کی بنا پر کر ڈالے جن کی سیرت بھروسے کے لائق نہ ہو۔ اسی قاعدے کی بنا پر محدثین نے علمِ حدیث میں جرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا تاکہ اُن لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں جن کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچی تھیں، اور فقہاء نے قانونِ شہادت میں یہ اصول قائم کیا کہ کسی ایسے معاملہ میں جس سے کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہو، یا کسی انسان پر کوئی حق عائد ہوتا ہو، فاسق کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ اس امر پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ عام دنیوی معاملات میں ہر خبر کی تحقیق اور خبر لانے والے کے لائق اعتماد ہونے کا اطمینان کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ آیت میں لفظ نَبَأٌ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ہر خبر پر نہیں ہوتا بلکہ اہمیت رکھنے والی خبر پر ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہاء کہتے ہیں کہ عام معاملات میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں جاتے ہیں اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں، اندر سے کوئی آکر کہتا ہے کہ آجاؤ، آپ اس کے کہنے پر اندر جا سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اِذن کی اطلاع دینے والا فاسق ہو یا صالح۔ اسی طرح اہلِ علم کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جن لوگوں کا فسق جھوٹ اور بدکرداری کی نوعیت کا نہ ہو، بلکہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر وہ فاسق قرار پاتے ہوں ان کی شہادت بھی قبول کی جا سکتی ہے اور روایت بھی۔ محض ان کے عقیدے کی خرابی ان کی شہادت یا روایت قبول کرنے میں مانع نہیں ہے۔

دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا ؟ اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔
ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں[۱۰] اور اللہ علیم و حکیم ہے[۱۱]۔

۹ یہ بات سیاق و سباق سے بھی مترشح ہوتی ہے ، اور متعدد مفسرین نے بھی اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ بنی المصطلق کے معاملہ میں ولید بن عقبہ کی دی ہوئی اطلاع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف فوجی اقدام کرنے میں متامل تھے ، مگر بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ ان پر فوراً چڑھائی کر دی جائے۔ اس پر اُن لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی کہ تم اس بات کو بھول نہ جاؤ کہ تمہارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں جو تمہارے مصالح کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تمہارا یہ چاہنا کہ اہم معاملات میں جو رائے تمہیں مناسب نظر آتی ہے آپ اُسی پر عمل کیا کریں ، سخت بے جا جسارت ہے اگر تمہارے کہنے پر عمل کیا جانے لگے تو بکثرت مواقع پر ایسی غلطیاں ہونگی جن کا خمیازہ خود تم کو بھگتنا پڑے گا۔

۱۰ مطلب یہ ہے کہ پُوری جماعتِ مومنین اُس غلطی کی مرتکب نہیں ہوئی جس کا صدور اُن چند لوگوں سے ہُوا جو اپنی خام رائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چلانا چاہتے تھے ، اور جماعتِ مومنین کے راہِ راست پر قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل و احسان سے ایمان کی روش کو ان کے لیے محبوب و دل پسند بنا دیا ہے اور کفر و فسق اور نافرمانی کی روش سے انہیں متنفر کر دیا ہے۔ اس آیت کے دو حصّوں میں رُوئے سخن دو الگ الگ گروہوں کی طرف ہے۔ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ کا خطاب پُوری جماعتِ صحابہ سے نہیں بلکہ اُن خاص اصحاب سے ہے جو بنی المصطلق پر چڑھائی کر دینے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ اور وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ کا خطاب صحابہ کی عام جماعت سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی رائے پر اصرار کرنے کی جسارت کبھی نہ کرتے تھے ، بلکہ آپ کی رہنمائی پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیشہ اطاعت کی روش پر قائم رہتے تھے جو ایمان کا تقاضا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جنہوں نے اپنی رائے پر اصرار کیا تھا وہ ایمان کی محبت سے خالی تھے۔ بلکہ اس سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان کے اس تقاضے کی طرف سے اُن کو ذہول ہو گیا تھا جس کے باعث انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں[۱۲] تو ان کے درمیان صلح کراؤ[۱۳]۔ پھر

موجودگی میں اپنی رائے پر اصرار کرنے کی غلطی کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کو اِس غلطی پر، اور اس کے بُرے نتائج پر متنبہ فرمایا، اور پھر یہ بتایا کہ صحیح ایمانی روش وہ ہے جس پر صحابہ کی عام جماعت قائم ہے۔

[۱۱] یعنی اللہ کا یہ فضل و احسان کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے۔ یہ نعمتِ عظمیٰ جس کو بھی وہ دیتا ہے حکمت کی بنا پر اور اس علم کی بنا پر دیتا ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے۔

[۱۲] یہ نہیں فرمایا کہ "جب اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑیں" بلکہ فرمایا یہ ہے کہ "اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں"۔ ان الفاظ سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ آپس میں لڑنا مسلمانوں کا معمول نہیں ہے اور نہیں ہونا چاہیے، نہ اُن سے یہ امر متوقع ہے کہ وہ مومن ہوتے ہوئے آپس میں لڑا کریں گے، البتہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اس صورت میں وہ طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ علاوہ بریں گروہ کے لیے بھی "فرقہ" کے بجائے "طائفہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں فرقہ بڑے گروہ کے لیے اور طائفہ چھوٹے گروہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ حالت ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی بڑی جماعتوں کا مبتلا ہو جانا متوقع نہیں ہونا چاہیے۔

[۱۳] اِس حکم کے مخاطب وہ تمام مسلمان ہیں جو ان دونوں گروہوں میں شامل نہ ہوں، اور جن کے لیے اُن کے درمیان صلح کی کوشش کرنا ممکن ہو۔ دوسرے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کی اپنی ملّت کے دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہوں اور وہ بیٹھے ان کی لڑائی کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ یہ افسوسناک صورتِ حال جب بھی پیدا ہو، تمام اہلِ ایمان کو اس پر بے چین ہو جانا چاہیے اور ان کے باہمی معاملات کی اصلاح کے لیے جس کے بس میں جو کوشش بھی ہو وہ اسے صرف کر ڈالنی چاہیے۔ فریقین کو لڑائی سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ انہیں خدا سے ڈرایا جائے۔ بااثر لوگ فریقین کے ذمہ دار آدمیوں سے جا کر ملیں۔ نزاع کے اسباب معلوم کریں اور اپنی حد تک ہر وہ کوشش کریں جس سے ان کے درمیان مصالحت ہو سکتی ہو۔

اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو[۱۳] یہاں

۱۳؎ یعنی مسلمانوں کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ زیادتی کرنے والے کو زیادتی کرنے دیں اور جس پر زیادتی کی جا رہی ہو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں، یا الٹا زیادتی کرنے والے کا ساتھ دیں۔ بلکہ ان کا فرض یہ ہے کہ اگر لڑنے والے فریقین میں صلح کرانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں، تو پھر یہ دیکھیں کہ حق پر کون ہے اور زیادتی کرنے والا کون۔ جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیں اور جو زیادتی کرنے والا ہو اس سے لڑیں۔ اس لڑائی کا چونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لیے یہ واجب ہے اور جہاد کے حکم میں ہے۔ اس کا شمار اُس فتنے میں نہیں ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ القائم فیہا خیرٌ من الماشی والقاعد فیہا خیر من القائم (اُس میں کھڑا رہنے والا چلنے والے سے، اور بیٹھ جانے والا کھڑا رہنے والے سے بہتر ہے)۔ کیونکہ اُس فتنے سے مراد تو مسلمانوں کی وہ باہمی لڑائی ہے جس میں فریقین عصبیت اور حمیّتِ جاہلیہ اور طلب دنیا کے لیے لڑ رہے ہوں۔ رہی یہ لڑائی جو زیادتی کرنے والے گروہ کے مقابلہ میں برسرِ حق گروہ کی حمایت کے لیے لڑی جائے، تو یہ فتنے میں حصّہ لینا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ تمام فقہاء کا اس کے وجوب پر اتفاق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں اس کے واجب ہونے پر کوئی اختلاف نہ تھا (احکام القرآن للجصاص)۔ بلکہ بعض فقہاء تو اسے جہاد سے بھی افضل قرار دیتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا پُورا زمانۂ خلافت کفار سے جہاد کرنے کے بجائے باغیوں سے لڑنے میں صرف کر دیا (روح المعانی)۔ اس کے واجب نہ ہونے پر اگر کوئی شخص اس بات سے استدلال کرے کہ حضرت علیؓ کی ان لڑائیوں میں حضرت عبداللہ بن عمر اور بعض دوسرے صحابہ نے حصّہ نہ لیا، تو وہ غلطی پر ہے۔ ابن عمر خود فرماتے ہیں کہ ما وجدت فی نفسی من شیئٍ ما وجدت من ھٰذہ الآیۃ انی لم اقاتل ھٰذہ الفئۃ الباغیۃ کما امرنی اللہ تعالیٰ، یعنی بہا معاویۃ ومن معہ الباغین علی علیؓ (بیہقی وحاکم)۔ "مجھے اپنے دل میں کسی بات پر اتنی زیادہ کھٹک محسوس نہیں ہوئی جتنی اِس آیت کی وجہ سے ہوئی کہ مَیں نے اللہ کے حکم کے مطابق اس باغی گروہ سے

یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے[۱۵]۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو[۱۶]۔

جنگ نہ کی۔ ان کا اشارہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف تھا جنہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی تھی۔"

زیادتی کرنے والے گروہ سے "قتال" کرنے کا حکم لازماً یہی معنی نہیں رکھتا کہ اس کے خلاف ہتھیاروں سے جنگ کی جائے اور ضرور اس کو قتل ہی کیا جائے۔ بلکہ اس سے مراد اس کے خلاف طاقت کا استعمال ہے، اور اصل مقصود اس کی زیادتی کا ازالہ ہے۔ اس مقصد کے لیے جس طاقت کا استعمال ناگزیر ہو اسے استعمال کرنا چاہیے، اور جتنی طاقت کا استعمال کافی ہو، نہ اس سے کم استعمال کرنی چاہیے نہ اس سے زیادہ۔

اس حکم کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو طاقت استعمال کر کے زیادتی کا ازالہ کرنے پر قادر ہوں۔

۱۵؎ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لڑائی باغی (زیادتی کرنے والے گروہ) کو بغاوت (زیادتی) کی سزا دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ اسے اللہ کے حکم کی طرف پلٹنے پر مجبور کرنے کے لیے ہے۔ اللہ کے حکم سے مراد یہ ہے کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی رُو سے جو بات حق ہو اسے یہ باغی گروہ قبول کر لینے پر آمادہ ہو جائے اور جو طرزِ عمل اس میزانِ حق کی رُو سے زیادتی قرار پاتا ہے اس کو چھوڑ دے۔ جونہی کہ کوئی باغی گروہ اس حکم کی پیروی پر راضی ہو جائے، اس کے خلاف طاقت کا استعمال بند ہو جانا چاہیے، کیونکہ یہی قتال کا مقصود اور اس کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد مزید دست درازی کرنے والا خود زیادتی کا مرتکب ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی رُو سے ایک نزاع میں حق کیا ہے اور زیادتی کیا، تو لامحالہ اس کو طے کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو امت میں اپنے علم اور بصیرت کے لحاظ سے اس کی تحقیق کرنے کے اہل ہوں۔

۱۶؎ محض صلح کرا دینے کا حکم نہیں ہے بلکہ عدل وانصاف کے ساتھ صلح کرانے کا حکم ہے! اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ صلح کوئی قابلِ قدر چیز نہیں ہے جو حق اور باطل کے فرق کو نظر انداز کر کے محض لڑائی روکنے کے لیے کرائی جائے اور جس میں برسرِ حق گروہ کو دبا کر زیادتی کرنے والے گروہ

اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[۱۲] مومن تو ایک دوسرے کے

کے ساتھ بے جا رعایت برتی جائے۔ صلح وہی صحیح ہے جو انصاف پر مبنی ہو۔ اسی سے فساد مٹتا ہے، ورنہ حق والوں کو دبانے اور زیادتی کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے کہ خرابی کے اصل اسباب جوں کے توں باقی رہتے ہیں، بلکہ ان میں اور اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سے بار بار فساد برپا ہونے کی نوبت پیش آتی ہے۔

[۱۲] یہ آیت مسلمانوں کی باہمی جنگ کے بارے میں شرعی قانون کی اصل بنیاد ہے۔ ایک حدیث کے سوا جس کا ہم آگے ذکر کریں گے، اس قانون کی کوئی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں نہیں ملتی، کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان جنگ کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی کہ آپ کے عمل اور قول سے اُس کے احکام کی تفصیلات معلوم ہوتیں۔ بعد میں اِس قانون کی مستند تشریح اُس وقت ہوئی جب حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خود مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ اُس وقت چونکہ بکثرت صحابۂ کرام موجود تھے، اس لیے ان کے عمل اور ان کے بیان کردہ احکام سے اسلامی قانون کے اِس شعبے کا مفصّل ضابطہ مرتب ہُوا۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اُسوہ اِس معاملہ میں تمام فقہاء کا اصل مرجع ہے۔ ذیل میں ہم اس ضابطہ کا ایک ضروری خلاصہ درج کرتے ہیں:

(۱) مسلمانوں کی باہمی جنگ کی کئی صورتیں ہیں جن کے حکم الگ الگ ہیں۔

(الف) لڑنے والے دونوں گروہ کسی مسلمان حکومت کی رعایا ہوں۔ اس صورت میں ان کے درمیان صلح کرانا، یا یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے زیادتی کرنے والا کون ہے اور طاقت سے اس کو حق کی طرف رجوع پر مجبور کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔

(ب) لڑنے والے فریقین دو بہت بڑے طاقت ور گروہ ہوں، یا دو مسلمان حکومتیں ہوں، اور دونوں کی لڑائی دنیا کی خاطر ہو۔ اس صورت میں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اس فتنے میں حصہ لینے سے قطعی اجتناب کریں اور فریقین کو خدا کا خوف دلا کر جنگ سے باز رہنے کی نصیحت کرتے رہیں۔

(ج) لڑنے والے وہ فریقین جن کا اوپر (ب) میں ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک حق پر ہو اور دوسرا زیادتی کر رہا ہو، اور نصیحت سے اصلاح پر آمادہ نہ ہو رہا ہو۔ اس صورت میں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف برسرِحق فریق کا ساتھ دیں۔

(د) فریقین میں سے ایک گروہ رعیت ہو اور اس نے حکومت، یعنی مسلم حکومت کے خلاف خروج کیا ہو۔ فقہاء اپنی اصطلاح میں اسی خروج کرنے والے گروہ کے لیے "باغی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

(۲) باغی، یعنی حکومت کے خلاف خروج کرنے والے گروہ بھی متعدد اقسام کے ہو سکتے ہیں:

(الف) وہ جو محض فساد برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے اس خروج کے لیے اُن کے پاس کوئی شرعی تاویل نہ ہو۔ ان کے خلاف حکومت کی جنگ بالاتفاق جائز ہے اور اس کا ساتھ دینا اہلِ ایمان پر واجب ہے، قطع نظر اس سے کہ حکومت عادل ہو یا نہ ہو۔

(ب) وہ جو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے خروج کریں، اور ان کے پاس کوئی شرعی تاویل نہ ہو، بلکہ ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ ظالم و فاسق ہیں۔ اس صورت میں اگر حکومت عادل ہو تب تو اس کا ساتھ دینا بلا کلام واجب ہے، لیکن اگر وہ عادل نہ بھی ہو تو اس حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے لڑنا واجب ہے جس کے ذریعہ سے فی الحال مملکت کا نظم قائم ہے۔

(ج) وہ جو کسی شرعی تاویل کی بنا پر حکومت کے خلاف خروج کریں، مگر ان کی تاویل باطل اور ان کا عقیدہ فاسد ہو مثلاً خوارج۔ اس صورت میں بھی مسلم حکومت، خواہ وہ عادل ہو یا نہ ہو، ان سے جنگ کرنے کا جائز حق رکھتی ہے اور اس کا ساتھ دینا واجب ہے۔

(د) وہ جو ایک عادل حکومت کے خلاف خروج کریں جبکہ اس کے سربراہ کی امارت جائز طور پر قائم ہو چکی ہو۔ اس صورت میں خواہ ان کے پاس کوئی شرعی تاویل ہو یا نہ ہو، بہرحال ان سے جنگ کرنے میں حکومت حق بجانب ہے اور اس کا ساتھ دینا واجب۔

(ھ) وہ جو ایک ظالم حکومت کے خلاف خروج کریں جس کی امارت جبراً قائم ہوئی ہو اور

جس کے امراء فاسق ہوں، اور خروج کرنے والے عدل اور حدود اللہ کی اقامت کے لیے اٹھے ہوں اور ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ خود صالح لوگ ہیں۔ اس صورت میں اُن کو "باغی" یعنی زیادتی کرنے والا گروہ قرار دینے اور ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دینے میں فقہاء کے درمیان سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

جمہور فقہاء اور اہل الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اُس کے انتظام میں چل رہا ہو، وہ خواہ عادل ہو یا ظالم، اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو، اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، اِلّا یہ کہ وہ کفر صریح کا ارتکاب کرے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ "جب مسلمان ایک فرمانروا پر مجتمع ہوں اور اس کی بدولت ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں، ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی جنگ کی طاقت رکھتا ہو اُس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اُس فرمانروا کے ساتھ مل کر خروج کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے" (المبسوط، باب الخوارج)۔ امام نَوَوِی شرح مسلم میں کہتے ہیں کہ "ائمہ، یعنی مسلمان فرمانرواؤں کے خلاف خروج اور قتال حرام ہے، خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں"۔ اِس پر امام نَوَوِی اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں۔

لیکن اس پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ فقہائے اسلام کا ایک بڑا گروہ جس میں اکابر اہلِ علم شامل ہیں، خروج کرنے والوں کو صرف اُس صورت میں "باغی" قرار دیتا ہے جبکہ وہ امامِ عادل کے خلاف خروج کریں۔ ظالم و فاسق امراء کے خلاف صلحاء کے خروج کو وہ قرآن مجید کی اصطلاح کے مطابق "بغاوت" کا مصداق نہیں ٹھیراتے، اور نہ ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک ظالم امراء کے خلاف قتال کے معاملہ میں اہلِ علم کو معلوم ہے۔ ابوبکر جصّاص احکام القرآن میں صاف لکھتے ہیں کہ امام صاحب اس قتال کو نہ صرف جائز، بلکہ سازگار حالات میں واجب سمجھتے تھے (جلد اوّل، ص ۸۱۔ جلد دوم،

ص ۳۹)۔ بنی امیہ کے خلاف زید بن علی کے خروج میں انہوں نے صرف خود مالی مدد دی، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرمائی (الجصاص، ج ۱، ص ۸۱)۔ منصور کے خلاف نفس زکیہ کے خروج میں وہ پوری سرگرمی کے ساتھ نفس زکیہ کی حمایت کرتے رہے اور اس جنگ کو انہوں نے کفار کے خلاف جہاد سے افضل قرار دیا (الجصاص، ج ۱، ص ۸۱۔ مناقب ابی حنیفہ للکردری، ج ۲، ص ۷۱-۷۲)۔ پھر فقہائے حنفیہ کا بھی متفقہ مسلک وہ نہیں ہے جو امام سرخسی نے بیان کیا ہے۔ ابن ہمام ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ الباغی فی عرف الفقہاء الخارج عن طاعة امام الحق "فقہاء کے عرف میں باغی وہ ہے جو امامِ حق کی اطاعت سے نکل جائے"۔ حنابلہ میں سے ابن عقیل اور ابن الجوزی امامِ غیر عادل کے خلاف خروج کو جائز ٹھیراتے ہیں اور اس پر حضرت حسین کے خروج سے استدلال کرتے ہیں (الانصاف، ج ۱۰، باب قتال اہل البغی)۔ امام شافعی کتاب الأم میں باغی اُس شخص کو قرار دیتے ہیں جو امام عادل کے خلاف جنگ کرے (ج ۴، ص ۱۳۵)۔ امام مالک کا مسلک المُدَوَّنہ میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ "خروج کرنے والے اگر امامِ عدل کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکلیں تو ان کے خلاف مقاتلہ کیا جائے" (جلد اول، ص ۴۰۷)۔ قاضی ابوبکر ابن العربی احکام القرآن میں اُن کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "جب کوئی شخص عمر بن عبدالعزیز جیسے امام عدل کے خلاف خروج کرے تو اس کو دفع کرنا واجب ہے، رہا کسی دوسری قسم کا امام تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اللہ کسی دوسرے ظالم کے ذریعہ سے اس کو سزا دیگا اور پھر کسی تیسرے ظالم کے ذریعہ سے ان دونوں کو سزا دے گا"۔ ایک اور قول امام مالکؒ کا انہوں نے یہ نقل کیا ہے: "جب ایک امام سے بیعت کی جا چکی ہو اور پھر اُس کے بھائی اس کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اگر وہ امامِ عادل ہو۔ رہے یہ ہمارے زمانے کے ائمہ تو ان کے لیے کوئی بیعت نہیں ہے، کیونکہ ان کی بیعت زبردستی لی گئی ہے"۔ پھر مالکی علماء کا جو مسلک سحنون کے حوالہ سے قاضی صاحب نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ "جنگ تو صرف امام عدل کے ساتھ مل کر کی جائے گی، خواہ پہلا امام عادل ہو یا

وہ شخص جس نے اس کے خلاف خروج کیا ہو۔ لیکن اگر دونوں عادل نہ ہوں تو دونوں سے الگ رہو البتہ اگر تمہاری اپنی جان پر حملہ کیا جائے یا مسلمان ظلم کے شکار ہو رہے ہوں تو مدافعت کرو"۔ یہ مسالک نقل کرنے کے بعد قاضی ابوبکر کہتے ہیں لا نقاتل الامع امام عادل یقدمہ اھل الحق لانفسھم "ہم جنگ نہیں کریں گے مگر اس امام عادل کے ساتھ جسے اہلِ حق نے اپنی امامت کے لیے آگے بڑھایا ہو"۔

(۳) خروج کرنے والے اگر قلیل التعداد ہوں اور ان کی پشت پر کوئی بڑی جماعت نہ ہو، نہ وہ کچھ زیادہ جنگی سروسامان رکھتے ہوں، تو ان پر قانونِ بغاوت کا اطلاق نہ ہو گا، بلکہ ان کے ساتھ عام قانونِ تعزیرات کے مطابق برتاؤ کیا جائے گا، یعنی وہ قتل کریں گے تو ان سے قصاص لیا جائے گا اور مال کا نقصان کریں گے تو اس کا تاوان ان پر عائد ہو گا۔ قانونِ بغاوت کا اطلاق صرف ان باغیوں پر ہوتا ہے جو کوئی بڑی طاقت رکھتے ہوں، اور کثیر جمعیت اور جنگی سروسامان کے ساتھ خروج کریں۔

(۴) خروج کرنے والے جب تک محض اپنے فاسد عقائد، یا حکومت اور اس کے سربراہ کے خلاف باغیانہ اور معاندانہ خیالات کا اظہار کرتے رہیں، ان کو قتل یا قید نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ ان کے خلاف صرف اس وقت کی جائے گی جب وہ عملاً مسلح بغاوت کر دیں اور خونریزی کی ابتدا کر بیٹھیں۔ (المبسوط، باب الخوارج۔ فتح القدیر، باب البغاۃ۔ احکام القرآن للجصاص)

(۵) باغیوں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے ان کو قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق دعوت دی جائے گی کہ وہ بغاوت کی روش چھوڑ کر عدل کی راہ اختیار کریں۔ اگر ان کے کچھ شبہات و اعتراضات ہوں تو انہیں سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس پر بھی وہ باز نہ آئیں اور مقاتلہ کا آغاز ان کی طرف سے ہو جائے، تب ان کے خلاف تلوار اٹھائی جائے گی۔ (فتح القدیر۔ احکام القرآن للجصاص)

(۶) باغیوں سے لڑائی میں جن ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے گا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر مبنی ہیں جسے حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے حاکم، بزار اور الجصاص نے نقل کیا ہے: "حضور

نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا اے ابن ام عبد، جانتے ہو اِس امت کے باغیوں کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا ان کے زخمیوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا، ان کے اسیر کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کے بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا، اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔" اس ضابطہ کا دوسرا ماخذ، جس پر تمام فقہائے اسلام نے اعتماد کیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول اور عمل ہے۔ آپ نے جنگ جمل میں فتحیاب ہونے کے بعد اعلان کیا کہ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرو، زخمی پر حملہ نہ کرو، گرفتار ہو جانے والوں کو قتل نہ کرو، جو ہتھیار ڈال دے اس کو امان دو، لوگوں کے گھروں میں نہ گھسو، اور عورتوں پر دست درازی نہ کرو خواہ وہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دے رہی ہوں۔ آپ کی فوج کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مخالفین کو اور ان کے بال بچوں کو غلام بنا کر تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر غضب ناک ہو کر آپ نے فرمایا، تم میں سے کون ام المومنین عائشہ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے؟

(۷) باغیوں کے اموال کا حکم، جو حضرت علیؓ کے اُسوۂ حسنہ سے ماخوذ ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا کوئی مال، خواہ وہ ان کے لشکر میں ملا ہو یا ان کے پیچھے ان کے گھروں پر ہو، اور وہ خواہ زندہ ہوں یا مارے جا چکے ہوں، بہر حال اسے نہ مالِ غنیمت قرار دیا جائے گا اور نہ فوج میں تقسیم کیا جائے گا۔ البتہ جس مال کا نقصان ہو چکا ہو، اس کا کوئی ضمان لازم نہیں آتا۔ جنگ ختم ہونے اور بغاوت کا زور ٹوٹ جانے کے بعد اُن کے مال انہی کو واپس دے دیئے جائیں گے۔ ان کے اسلحہ اور سواریاں جنگ کی حالت میں اگر ہاتھ آجائیں تو انہیں اُن کے خلاف استعمال کیا جائے گا، مگر فاتحین کی ملکیت بنا کر مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا، اور اگر ان سے پھر بغاوت کا اندیشہ نہ ہو تو ان کی یہ چیزیں بھی واپس دے دی جائیں گی۔ صرف امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ حکومت اسے غنیمت قرار دے گی (المبسوط، فتح القدیر۔ الجصاص)۔

(۸) ان کے گرفتار شدہ لوگوں کو یہ عہد لے کر کہ وہ پھر بغاوت نہ کریں گے، رہا کر دیا جائے گا (المبسوط)۔

(۹) باغی مقتولوں کے سر کاٹ کر گشت کرانا سخت مکروہ فعل ہے، کیونکہ یہ مُثلہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے پاس رومی بطریق کا سر کاٹ کر لایا گیا تو آپ نے اس پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہمارا کام رومیوں اور ایرانیوں کی پیروی کرنا نہیں ہے۔ یہ معاملہ جب کفار تک سے کرنا روا نہیں ہے تو مسلمانوں کے ساتھ تو یہ بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہونا چاہیے (المبسوط)

(۱۰) جنگ کے دوران میں باغیوں کے ہاتھوں جان و مال کا جو نقصان ہوا ہو، جنگ ختم ہونے امن قائم ہو جانے کے بعد اس کا کوئی قصاص اور ضمان اُن پر عائد نہ ہو گا۔ نہ کسی مقتول کا بدلہ لیا جائے گا اور نہ کسی مال کا تاوان اُن پر ڈالا جائے گا، تاکہ فتنے کی آگ پھر نہ بھڑک اٹھے۔ کی باہمی لڑائیوں میں یہی ضابطہ ملحوظ رکھا گیا تھا (المبسوط۔ الجصّاص۔ احکام القرآن ابن العربی)

علاقوں پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا ہو اور وہاں انہوں نے اپنا نظم و نسق قائم کر کے محصولات وصول کر لیے ہوں، تو حکومت ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کے اُس زکوٰۃ اور اُن محصولات کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ اگر باغیوں نے یہ اموال یے ہوں تو عنداللہ بھی وہ ادا کرنے والوں پر سے ساقط ہو جائیں گے لیکن یقے پر تصرف کیا ہو، تو یہ ادا کرنے والوں کے اور ان کے خدا کے درمیان معاملہ ، ادا کر دیں (فتح القدیر۔ الجصّاص۔ ابن العربی)

ہ میں جو عدالتیں قائم کی ہوں، اگر ان کے قاضی اہلِ کمہ ہوں، تو وہ برقرار رکھے جائیں گے اگرچہ مراں کے فیصلے غیر شرعی ہوں اور مائے جائیں تو وہ نافذ نہیں کیے جائیں گے۔ ے کوئی وارنٹ یا پروانۂ امر حکومت کی عدالتوں

بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو ۱۸ اور اللہ سے ڈرو، ع۱
امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا ع

(۱۷) باغیوں کی شہادت اسلامی عدالتوں میں قابلِ قبول نہ ہو گی کیونکہ اہلِ عدل کے خلاف جنگ کرنا فسق ہے۔ امام محمد کہتے ہیں کہ جب تک وہ جنگ نہ کریں اور اہلِ عدل کے خلاف عملاً خروج کے مرتکب نہ ہوں، ان کی شہادت قبول کی جائے گی، مگر جب وہ جنگ کر چکے ہوں تو پھر میں ان کی شہادت قبول نہ کرونگا (الجصاص)

ان احکام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفار کے خلاف جنگ اور مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کے قانون میں کیا فرق ہے۔

۱۸ یہ آیت دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اُخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس حکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا ہے جن سے اس کی پوری روح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کرونگا۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا۔ تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہونگا (بخاری، کتاب الایمان)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر" (بخاری، کتاب الایمان۔ مسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالک نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے" (مسلم، کتاب البر والصلۃ۔ ترمذی، ابواب البر والصلۃ)

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے" (مُسند احمد)

حضرت سہل بن سعد ساعدی آپ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "گروہ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے" (مُسند احمد)۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک اور حدیث میں ہے، جس میں آپ نے فرمایا ہے "مومنوں کی مثال آپس کی محبت، وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم و شفقت کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو سارا جسم اس پر بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے" (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ "مومن ایک دوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے" (بخاری، کتاب الادب؛ ترمذی، ابواب البرّ والصلہ)

مذہب اور تجدیدِ مذہب

(۲)

مذہبی بگاڑ کی مختلف صورتیں اور اس کے اسباب

عبد الحمید صاحب صدیقی

مذہب کو مجرد روحانی کیف و مستی کا مترادف سمجھنے اور ذاتِ مطلق میں انسانی روح کے ادغام کو مذہب کا منتہائے مقصود ٹھیرانے کے لیے روحانیت کے پرستاروں کو ذاتِ مطلق کے بارے میں عجیب و غریب نظریات گھڑنے پڑے۔ وہ شخص جو کسی الہامی مذہب کے مبادیات سے بھی واقف ہے وہ اس حقیقت کو پوری طرح جانتا ہے کہ مذہب کی ساری عمارت بعض ایسے بنیادی حقائق پر استوار ہے جن کی صحت پر انسانی عقل و فہم پوری طرح گواہ ہے لیکن وہ حقائق انسان کی سرحدِ ادراک سے ماوراء ہیں اور انہیں سمجھنے کے لیے ہمیں لامحالہ قادرِ مطلق کے اُن "فرستادوں" پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے اُس ذاتِ برحق نے بھیجے ہیں۔ چونکہ منشائے الٰہی ہمیں براہِ راست معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے ہم ایک واسطے کے لازماً محتاج ہیں، اس لیے ہر الہامی مذہب میں ایمان بالغیب کو ہمیشہ ایک بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک انسان اور اُس کے مالک کے درمیان جتنے حجابات حائل ہیں وہ اگر اٹھا لیے جائیں اور حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہو تو پھر انبیاء علیہم السلام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کے یہ پاکباز بندے اسی لیے تو مبعوث فرمائے جاتے ہیں کہ ہم ان حجابات کے پیچھے مستور حقیقتوں کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں۔

دوسری طرف انسان کا دل مشاہدۂ حق کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتا ہے اور اس بات کی آرزو کرتا ہے کہ کسی طرح حقیقتِ منتظر اپنا حجاب اٹھا کر اس کے سامنے جلوہ افروز ہو۔ اس کی معقول صورت تو یہ تھی کہ انسان اس مشاہدہ کے لیے اُس وقت تک انتظار کرتا جب تک کہ اُسکی رُوح پیکرِ خاکی سے آزاد ہو کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر نہ ہو اور اس عرصے میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے روحانی اور اخلاقی ضابطۂ حیات کے مطابق اس کی تربیت کرتا رہتا تاکہ وہ پاک اور منزہ ہو کر اُس کے حضور میں پیش ہو۔ مگر انسان کی بے تابی نے مشاہدۂ حق کے لیے حیاتِ مستعار کی چند گھڑیوں کے لیے بھی انتظار کرنا گوارا نہ کیا اور اس پیکرِ خاکی کے ساتھ ہی اپنی روح کو روحِ مطلق کے ساتھ ہم آغوش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ چونکہ یہ ایک اَن ہونی بات تھی اس لیے اُس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ روحانیت پرستوں کی مخالفت کا سب سے بڑا ہدف غیب کے وہ پردے ہیں جن پر ایمان کا سارا دار و مدار ہے۔ چونکہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کی غایت صرف روحانی کیف و سرور ہے اور یہ گوہرِ مقصود مشاہدۂ حق کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ خالقِ کائنات نے عابد و معبود کے درمیان غیب کے جتنے پردے حائل کر رکھے ہیں انہیں ہٹایا جائے تاکہ حقیقت بے نقاب ہو کر اُن کے سامنے آ جائے۔

غیب کے یہ پردے، فطرت اور مذہب کے نہایت اہم اجزا ہیں۔ اگر انہیں درمیان سے ہٹا دیا جائے تو مذہب کی پوری عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔ خالقِ کائنات اور انسان کے درمیان حجابات حائل ہونے ہی کی وجہ سے انسان کے دل میں ذاتِ برحق کو سمجھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اسی امنگ کی وجہ سے وہ ان ذرائع کی جستجو کرتا ہے جن سے وہ اس کی معرفت حاصل کر سکے۔ اور پھر وہ اپنی اسی امنگ کو پورا کرنے کے لیے ان مقدس نفوس کی طرف رجوع اور ان پر اعتماد کرتا ہے جنہیں ذاتِ برحق کی پوری معرفت حاصل ہے۔ زندگی کے اس طرف، عالمِ ناسوت میں انسان کا مطالعہ و مشاہدہ، خواہ اس کا تعلق

اَنفس سے ہو یا آفاق سے، انسان کے علم کی سرحدوں کو بلاشبہ وسیع کر دیتا ہے۔ لیکن ان نئی سرحدوں پر کھڑے ہو کر عقل سلیم رکھنے والے انسان کے اندر کبھی مغرورانہ احساس پیدا نہیں ہونے پاتا، کہ اس نے انفس و آفاق کے سارے گوشوں کا اچھی طرح ادراک کر لیا ہے۔ بلکہ اس مقام پر پہنچ کر وہ

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست

کہہ کر حیرانی کے عالم میں گم ہو جاتا ہے۔

عالم غیب کے معاملے میں انسان کی اس بے بسی اور بیچارگی کا تقاضا یہ تھا کہ انسان نہ تو کائنات کے تھوڑے سے علم پر اتراتا اور نہ مشاہدۂ باطن کی چند جھلکیوں پر نازاں ہوتا۔ لیکن ان دونوں گروہوں نے اس راہ میں عجیب و غریب لغزشیں کھائیں۔ کائنات کا جائزہ لینے والوں نے خالق کی صنعت گری کے نمونے دیکھ کر اس کی قدرت کاملہ پر ایمان لانے کے بجائے اپنے آپ کو محسوس اور مادی دنیا کے خم و پیچ میں الجھا دیا اور اس غلط فہمی میں گرفتار ہو گئے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی اس کائنات کی، یعنی خود اپنی اصل خالق ہے، کسی اعلیٰ و ارفع اور صاحب ارادہ ذات کے تدبّر اور حکمت بالغہ کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح مشاہدۂ باطن سے روحانی کیف و سرور حاصل کرنے والوں نے کشف کی چند تجلیات کو ہی اصل چیز سمجھ لیا اور یہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے وہ مقام محمود حاصل کر لیا ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

خالق و مخلوق کے درمیان غیب کے جو پردے حائل ہیں انہیں دور کرنا چونکہ انسان کے بس میں نہیں ہے اس لئے اس نے مشاہدۂ حق اور اس کے ادراک کے لئے قادر مطلق کی صنعت گری کو اس ذات کا ایک جزو لاینفک سمجھ کر اپنے روحانی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کی بیجا کوشش کی اور اس ذوق نے مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کیں۔

(ا) خالق کائنات چونکہ اپنی ذات کے لحاظ سے مستور ہے اس لیے ایک گروہ نے اپنے حاسۂ مذہبی کی تشفی کے لیے معبودِ حقیقی کی جگہ کچھ مادی پیکر تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا اور پھر ان کے ساتھ عبدیت کا تعلق استوار کیا۔ یہ پیکر ان کے نزدیک گو کائنات کے اصل خالق نہ تھے لیکن اس کے

مظہر ضرور تھے۔ ان کی موجودگی مذہب پرستوں کے لیے روحانی تسکین کا سب سے موثر ذریعہ تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ ایک ان دیکھے خدا سے رابطہ قائم کرنے کے بجائے ان بتوں کے ذریعہ حقیقتِ کبریٰ کا محسوس شکل میں ادراک آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اپنا کر وہ یہ سمجھتے تھے کہ پردۂ غیب کی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں اور ان کے روحانی کیف و سرور میں اضافہ ممکن ہے۔

(ب) مٹی اور پتھر کے بتوں کے علاوہ روحانیت کے بعض علمبرداروں نے اشجار پرستی، کواکب پرستی، اور دوسرے مظاہر قدرت کی پرستش کا مسلک اختیار کیا۔ قدرت کے ان رنگا رنگ مظاہر کی پرستش کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ عابد و معبود کے درمیان غیب کے جو پردے حائل ہیں انھیں درمیان سے ہٹا کر حقیقت سے براہِ راست تعلق پیدا کیا جائے۔ تاکہ انسان روحانی سرور سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا سکے۔ اس طرزِ فکر کا آغاز بھی ایک صحیح احساس سے ہوا تھا۔ مناظرِ فطرت اور حسنِ قدرت نے انسان کے اندر ہمیشہ ایک ایمانی کیفیت پیدا کی ہے۔ اور اس نے فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی نے پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کیا ہے۔ سورج کی خشمگین کرنوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اصحاب بصیرت کو ہمیشہ آیات الٰہی نظر آئی ہیں۔ دنیا کے سارے مذاہب نے انسان کے اس فطری احساس کو ابھارا ہے لیکن اس صحیح جذبے نے ایک غلط اثر کے تحت بھٹک کر مظاہر پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ مظاہر خالق کائنات کی صنعت گری کے نہایت ہی اعلیٰ اور نادر نمونے ہیں، اور اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انہیں بنانے والی ذات بڑی قدرت، حکمت اور دانائی رکھتی ہے اور اس پورے نظام کو بڑے تدبّر کے ساتھ چلا رہی ہے، لیکن روحانیت کے بے سمجھ علمبرداروں نے اور روحانی کیف و مستی کے جھوٹے دعویداروں نے ان مظاہر کو دیکھ کر "فتبارك الله احسن الخالقين" پکارنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی۔ اس معاملے میں

جو زیر دست ٹھوکر انہوں نے کھائی اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ مظاہر کائنات کو خالق کی صنعت گری کے نمونے سمجھنے کے بجائے اُس ذاتِ حق کا لباسِ مجاز سمجھ کر اس پر فریفتہ ہو گئے اور چونکہ یہ مادّی اور محسوس مظاہر ان کے لیے پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتِ کبریٰ کی بہ نسبت زیادہ روحانی کیف پیدا کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے ان کی پرستش شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اُس خالق سے رشتہ توڑ لیا جس کی صنعت اور کاریگری کے یہ نمونے تھے۔

وجہ ا بعض حضرات جو اُن دیکھے خدا پر ایمان لانے کے معاملے میں زیادہ محتاط تھے انہوں نے مظاہر پرستی کا شیوہ تو اختیار نہ کیا لیکن انہوں نے ان مظاہر کا باری تعالیٰ سے اس طرح کا تعلق قائم کر دیا جس سے کائنات اور خالقِ کائنات کو ایک دوسرے سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے تصورات اسی تعلق کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ ان تصورات کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی تہ میں بھی یہی ایک جذبہ کام کر رہا ہے کہ عابد و معبود کے درمیان غیب کے جو حجابات حائل ہیں انہیں کسی طرح دور کیا جائے اور حقیقتِ کبریٰ کا خود مشاہدہ کر کے اُس سے روحانی کیف حاصل کیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ بعض لوگ وحدۃ الوجود (MONISM) اور ہمہ اوست (PANTHEISM) کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بہت سی چیزیں مشترک اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔

وحدۃ الوجود کا اطلاق دو قسم کے نظریات پر ہوتا ہے۔ ایک وہ جو انسان کو صریح کفر کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جس کے پیچھے خدا کی قدرت اور برتری کا احساس کارفرما ہے۔ اگر ایک شخص یہ عقیدہ رکھے کہ "اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے یعنی سورج، چاند، پہاڑ، اشجار، انسان اور حیوان وہی خدا ہے اور اس سے الگ کوئی برتر اور بزرگ ذات نہیں" تو یہ کفر ہے۔ فلاسفہ مغرب میں

اس نظریے کا علمبردار مشہور مغربی مفکر اسپنوزا (م ۱۶۷۷ء) ہے۔[1]

اہلِ مذہب نے اس نظریہ سے براءت کا اظہار کیا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرا نظریہ پیش کیا ہے جو اُن کے نزدیک خالق کی عظمت اور اس کی برتری کا مظہر ہے۔ انہوں نے وحدۃ الوجود کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ مادہ کی محدود دنیا باری تعالیٰ سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ خدا ہی اصلی اور حقیقی وجود ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بقول غالب "حلقۂ دامِ خیال" ہے۔ اس ذاتِ برحق کو مختلف لوگوں نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً افلوطین اسے الواحد کہہ کر پکارتا ہے، شنکر اچاریہ اسے لفظ برہمن سے تعبیر کرتا ہے، شیخ محی الدین ابن عربی اسے الحق کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ہیگل اسے روحِ مطلق سے تعبیر کرتا ہے۔

ذاتِ کبریٰ اور انسان کے مابین حجابات کو دُور کرنے کے لیے دوسرا جو نظریہ وضع کیا گیا اسے تصوّف کی زبان میں "ہمہ اوست" کہا جاتا ہے۔

پروفیسر ابراہام ولف نے اس کی مندرجۂ ذیل تعریف کی ہے:

"ہمہ اوست ایک ایسا متصوفانہ اور دینیاتی نظریہ ہے جس کے مطابق خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہ کائنات خدا سے الگ کوئی مخلوق نہیں بلکہ یہ کائنات ہی خدا اور خدا ہی کائنات ہے۔"[2]

اس تعریف کے الفاظ میں مختلف مذاہب کے صوفیاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ سارے حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کائنات اور اس میں جو صفات، افعال اور آثار ملتے ہیں، وہ بدونِ ذات ممکن نہیں اور انہیں کسی حالت میں ذات برحق سے جدا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ہر صفت اور ہر فعل اور ہر اثر میں ذاتِ حق

---

[1] MYSTICISM & PHILOSOPHY BY W. T. STACE ص ۲۳۷

[2] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA

دیکھیے مضمون PANTHEISM

جلوہ گر اور کار فرما ہے۔ اسی حقیقت کو غالب نے شاعرانہ زبان میں یوں بیان کیا ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس ضمن میں حافظ عبدالرحمٰن جامی کی صراحت بھی قابلِ غور ہے:

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ اوست
در دلقِ گدا و اطلسِ شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و در نہاں خانہ جمع
باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں مشاہدۂ حق سے کیف و سرور حاصل کرنے اور عابد و معبود کے درمیان حجابات کو ہٹانے کے لیے ہمہ اوست کا عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ ہندوؤں کے ہاں اس عقیدہ نے کس قسم کے احساسات کو ابھارا اس کا اندازہ اپنشدوں کے مندرجہ ذیل اشلوکوں سے لگایا جا سکتا ہے:

(اے ذات برحق)، تم تو آگ ہو،
تم تو سورج ہو،
تم ہوا ہو
تم چاند ہو
تم ستاروں سے روشن فلک ہو،
تم برہمنِ اعظم ہو،
تم جل ہو،
تم فی الحقیقت ان ساری چیزوں کے خالق ہو[1]

[1] THE UPANISHADS TRANSLATED BY SWAMI PRABHAVANDA AND FREDREICK MANEHESTOR.

ایک مسیحی متصوف اپنے روحانی تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت کا یوں اظہار کرتا ہے :

"سینٹ پال کا قول ہے ہم ذات باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب ایک شے دوسری میں مدغم ہوجائے تو ان دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہورہا ہوں اور وہ ذاتِ برحق مجھ سے ہم آہنگ ہورہی ہے۔ قسم ہے اُس زندۂ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالقِ کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہم اب دونوں ایک ہی ہیں۔

وہ آنکھ جس سے میں دیدارِ خداوندی سے لطف اندوز ہوتا ہوں، اُسی آنکھ سے وہ علیم و بصیر ذات میرا نظارہ کر رہی ہے۔ میری آنکھ اور خدا کی آنکھ دونوں ایک ہی ہیں[1]"

اسی ضمن میں ملّتِ اسلامیہ کے ایک معتقد صوفی اور وحدۃ الوجود کے نامور علمبردار شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ کی تصریحات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ایک مقام پر خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"حق تعالیٰ ہر شاہد میں سے شاہد ہے اور ہر مشہود میں سے مشہود ہے۔ یہ کائنات خالقِ کائنات کا پیکرِ محسوس ہے اور ذاتِ برحق اس کی روح اور اس کی مُدبّر۔"

اس نظریہ کی تصریح انہوں نے مندرجۂ ذیل اشعار میں بھی کی ہے :

فھوا لکون کلہ　　　　وھوالواحد الذی
قام کونی بکونہ[2]

تمام وجود ایک ہی ہے۔ وہ ایک ہی ہے جس کے وجود سے میرا وجود قائم ہے۔

---

[1] یہ دونوں اقوال ایک مشہور فلسفی اور متصوف MEISTER ECHART کے ہیں۔ اس شخص کو قرونِ وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے وعظ نمبر ۲۵ صفحہ ۲۱۳

[2] فصوص الحکم مرتبہ ابوالعلاء عفیفی ص۱۱۱

فانت عبدٌ و انت ربٌ لمن له فیه انت عبدٌ[1]

تو بندہ ہے اور تو رب سے جدا نہیں۔ کس کا بندہ ؟ اس کا بندہ جس میں تو فنا ہو گیا۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر باری تعالیٰ، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم تمہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ دیکھنے والوں کو یہ حقیقت پوری طرح معلوم ہو جائے کہ ذات برحق ہی موجود حقیقی ہے۔ اس اعتبار سے تم اُس کے مادی جسم ہو اور وہ تمہاری روح[2] "

شیخ محی الدین ابن عربی دنیائے اسلام کے پہلے صوفی اور فلسفی ہیں جنہوں نے نظریۂ وحدۃ الوجود کی صحت قرآن مجید اور سنت نبوی سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افکار نے مسلمان صوفیاء پر نہایت گہرے اثرات مترتب کیے ہیں۔ صدر الدین قونوی، مولانا رومی، حافظ عبدالرحمٰن جامی، شیخ عراقی، شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، ملا بحر العلوم لکھنوی میں سے کوئی ایک بزرگ بھی ایسے نہیں جن کے نظریات پر شیخ اکبر کے تصورات کی گہری چھاپ نہ ہو۔ خالق کائنات اور کائنات کے باہمی ربط اور مشاہدۂ حق کے متعلق انہوں نے جو خیالات پیش کیے ہیں اُن کی مسلمان صوفیاء نے بڑی پذیرائی کی۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے ان خیالات سے تھوڑا بہت اختلاف بھی کیا ہے مگر اکثر حضرات نے ان کی ایسی توجیہات پیش کیں جن سے انہیں کتاب و سنّت کے زیادہ سے زیادہ مطابق بنایا جا سکے لیکن ان سب حضرات کو دو باتوں پر ہمیشہ اتفاق رہا ہے۔ ایک یہ کہ انسان باری تعالیٰ کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور اگر وہ اس معاملے میں ناکام ہے تو اس کی وجہ اس کی اپنی نظر کی کمزوری ہے۔ دوسرے یہ کائنات خالق کا لباس مجاز ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات نے وحدۃ الوجود کے متعلق صوفیاء

---

[1] فصوص الحکم مرتبہ ابو العلاء عفیفی ص ۹۲

[2] ایضاً ص ۶۹

کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمان صوفیاء یہ نہیں کہتے کہ یہ "کائنات جلوۂ ذات ہے" بلکہ یہ کہتے ہیں کہ "جلوۂ ذات یہ کائنات ہے"۔ اس سے وہ اُس نازک فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں جو وحدۃ الوجود کے متعلق اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات جلوۂ ذات ہے تو اس سے کائنات کی ہستی کا اثبات ہوتا ہے جو کفر ہے۔ اس لیے وحدۃ الوجود کی صحیح اسلامی صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے: جلوۂ ذات یہ کائنات ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ جلوۂ ذات بسببِ تعینات بشکل کائنات نظر آرہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ باری تعالیٰ کے سوا کوئی شئے حقیقی معنیٰ میں موجود ہی نہیں۔ صرف ذاتِ حق ہی موجود ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی وجود کے آثار و اَظلال ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اس موضوع پر فتوحاتِ مکیہ جلد اول اور فصوص الحکم میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ خصوصاً وہ فَص جس کا عنوان حکمۃ نفثیۃ فی حکمۃ شیثیۃ ہے اس میں انہوں نے اس پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ شیخ اکبر اور اُن کے ہمنوا حضرات نے کائنات، انسان اور خدا کے باہمی تعلق کو آئینہ کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان تجلّی الٰہی کو اپنی حیثیت اور استعداد کے مطابق ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر وہ جب اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے تو درحقیقت باری تعالیٰ کی شان تنزیہ کو نہیں دیکھتا بلکہ خود اپنے آپ کو اُس میں منعکس پاتا ہے۔ دوسری طرف خود اللہ تعالیٰ اپنے اسماء اور اپنی صفات کا ظہور انسان میں دیکھتا ہے۔ اسی حقیقت کی شیخ اکبر نے ابو نواس کے مندرجۂ ذیل شعر کی مدد سے توضیح کی ہے۔

رق الزجاج ورقت الخمر

وتشاكلا فتشابها الامر

فكانما خمر ولا قدح

وكانما قدح ولا خمر

پیمانہ اور شراب دونوں لطیف ہو گئے اور دونوں باہم اس طرح مل جل گئے ہیں کہ امتیاز

باقی نہیں رہا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے اور پیالہ نہیں یا یوں کہیے کہ پیالہ ہے اور شراب نہیں۔
ایک مشہور شاعر نے اردو میں وحدۃ الوجود کے اس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے:

تو آئینہ میں ہوں عکس، مَیں آئینہ تو ہے شخص
آئینہ جب اٹھا دیا، عکس و شخص کا فرق مٹا

یہ غالباً آئینہ اٹھنے اور عکس و شخص کا فرق مٹنے ہی کا نتیجہ تھا کہ حلاج نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا اور ذات حق کے بارے میں عجیب و غریب تصورات پیش کیے۔ ہم یہاں صرف دو اشعار نقل کرتے ہیں:

سبحان من اظھر ناسوت
سرسنا لاھوتہ الثاقب
ثم بدا مستتراً ظاھراً
فی صورۃ الآکل الشارب[1]

"پاک ہے وہ ذات جس نے عالمِ ناسوت میں اپنے درخشاں لاہوت کی بلندیوں کے راز کو نمایاں کر دیا۔ پھر کھانے پینے والے انسان کی شکل میں علانیہ اور در پردہ جلوہ گر ہوا۔"
انسان اور اس کے خالق کے درمیان جو بنیادی فرق و امتیاز ہے اُسے حلاج انیت کا پردہ سمجھتا ہے اور اسے دُور کرنے کے لیے خدا سے یوں دعا کرتا ہے:

بینی و بینك انی تنازعنی فارفع بجنك انی من البین

"میرے اور تیرے درمیان میری انیت حائل ہے۔ اے میرے پروردگار تیری ذات کی قسم تو جدائی اور بعد کی اس صورت کا تدارک فرما۔"
وحدۃ الوجود کے ان علمبرداروں کی پیروی میں بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر انسان مجاہدہ اور ریاضت کرے تو وہ اس دنیا میں بھی باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ ان کے

---

[1] یہ اشعار امام ابن تیمیہ کی کتاب الحج النقلیہ والعقلیہ سے نقل کیے گئے ہیں۔

نزدیک ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش ایمان کی پہلی منزل ہے جس پر عاشقانِ ربانی کبھی قناعت نہیں کر سکتے۔ انہیں اس راہ میں مزید منزلیں طے کر کے وہ بلند و بالا مقام حاصل کرنا ہے جس میں روح ذاتِ حق کی تجلیات سے براہِ راست لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

ذاتِ حق ایک بدیہی حقیقت ہے، اس سے کسی معقول انسان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر شیخ اکبر اور اُن کے طرز پر سوچنے والے دوسرے بزرگ صرف اس اعتراف کو ایمان کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک ذات باری تعالیٰ عوام الناس کے لیے مستور و محجوب ہے اور ان کی کم علمی کی بنا پر انہیں ایمان بالغیب کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ باقی رہے خواص، یعنی اہلِ کشف، تو اُن کے لیے ذاتِ حق مشہود و محسوس ہے۔ شیخ اکبر ایمان بالغیب پر قناعت کرنے والوں کو آبِ شور کے طلبگاروں سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے اُن کی روحانی پیاس کسی طور بھی بجھ نہیں سکتی بلکہ اسے مزید بھڑکاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں اہلِ کشف و وجدان شیخ کی نظر میں آبِ شیریں کے طالب ہیں جس سے انسان صحیح معنوں میں روحانی تسکین حاصل کرتا ہے[1]۔

مسلمان صوفیا نے وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے متعلق جن افکار کا اظہار کیا ہے اور اُن کی تشریح و توجیہ میں دوسرے بزرگانِ امت نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر کوئی تفصیلی گفتگو اس وقت ممکن نہیں۔ مجھے یہاں اس امر سے بھی کوئی بحث نہیں کہ ان حضرات کے یہ تصورات اسلام سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے اس مقام پر یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب میں روحانیت کے پرستاروں نے ان حجابات کو دُور کرنے کی کوشش جو انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کے درمیان حائل ہیں اور وہ اس آرزو میں ہمت آزما رہے کہ غیب کے سارے پردوں کو درمیان سے ہٹا کر کسی طرح ذاتِ حق کا براہِ راست مشاہدہ کیا جائے تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ روحانی کیف و سرور حاصل ہو۔ اس قسم کی کوششوں سے مذہب کو کیا فوائد حاصل ہوئے اور انہیں کس قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑے اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

---

[1] فصوص الحکم: فص حکمۃ احدیۃ فی کلمۃ ہودیۃ ص۱۱۰

(د) خدا پرستی کے معاملے میں بگاڑ کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں ان میں ایک صورت انسان پرستی کی بھی ہے۔ اس کے پیچھے بھی وہی عوامل کارفرما ہیں جو غیر اللہ کی پرستش کے غلط تصور میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

مذہب کے عناصر ترکیبی میں، جیسا کہ میں نے گذشتہ صفحات میں عرض کیا ہے ایک ضروری عنصر اُن بزرگ و برتر انسانوں کا بھی ہے جو باری تعالیٰ کے منشا اور ارادہ کو نوعِ بشری پر واضح کرنے کے لیے خود اس کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ انہیں چونکہ خداوند قدوس انسانوں کے لیے نمونہ اور مثال کے طور پر پیش کرتا ہے اس لیے یہ مقدس حضرات اپنے مالک پر گہرے ایمان ویقین، نوعِ بشری کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت، اور اسے راہِ راست پر لانے کے لیے بے پناہ خلوص اپنی بے داغ سیرت و کردار، اور اللہ تعالیٰ کے منشا کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے غیر معمولی تدبّر، تفکّر اور استقلال کا عملی ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اس معاملے میں ان کی حیثیت بے مثال ہوتی ہے، اس لیے وہ ہر معاشرے میں اپنی الگ امتیازی حیثیت کی وجہ سے عام انسانوں میں نمایاں طور پر ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ پھر چونکہ باری تعالیٰ اپنی حجت کو انسانوں پر قائم کرنے کے لیے اپنے ان بندوں کو بعض ایسے انعامات سے بھی نوازتا ہے جن سے عام آبادی کو سرفراز نہیں کیا جاتا، جیسے معجزات، اس لیے ان حضرات کا وجود انسانوں کے لیے حیرت کا موجب بن جاتا ہے۔ اور وہ ان کی پیروی کرنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ کے ان پاکباز بندوں کو جس قسم کی مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے لیے انسانوں کو ایک اَن دیکھے خدا کے بندے بنانا، اپنی شخصیت کا پرستار بنانے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

ان مقدس نفوس کی پاکیزہ زندگیوں، ان کے اعلیٰ اخلاق، ان کے حیرت انگیز کارناموں، اور ان کے خدائے لم یزل پر نہایت پختہ اور محکم یقین کو دیکھ کر عوام کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ ان پاکباز بندوں کا کوئی تعلق عام انسانی برادری سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں عجیب و غریب اُلجھنیں پیدا ہوتیں اور وہ حیران و ششدر ہو کر پوچھتے کہ آخر کسی انسان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہے

کہ وہ اس اعلیٰ اور ارفع مرتبہ پر پہنچ جائے۔ لازمی طور پر ان میں اُلوہیت کی شان موجود ہے۔ یا تو ذاتِ باری ان کے اندر خود حلول کر گئی ہے اور وہ ان کی شخصیت کے پردے میں خود سرگرمِ عمل ہے یا اس نے اپنی خدائی میں انہیں شریک ٹھہرا لیا ہے اور اپنی کبریائی کے کچھ حصے انہیں تقسیم کر دیئے ہیں۔ لہٰذا انہیں خدا کے بندے سمجھ کر ان کی وساطت سے خدا کی معرفت حاصل کرنا خدا کی نعمت کو ٹھکرانا ہے۔ جب خود باری تعالیٰ غیب کے سارے پردے ہٹا کر ان مقدس ہستیوں کی شکل میں ان کے سامنے جلوہ آرا ہے تو انسان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان مرئی خداؤں کو چھوڑ کر غیر مرئی خدا کے پیچھے نہ پڑے۔ جب منزلِ مقصود خود چل کر اُن کے پاس آ گئی ہے تو پھر یہ بدنصیبی ہے کہ انسان اسے نشانِ منزل سمجھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ اس موقع سے پُورا پُورا فائدہ اٹھائے اور ان محسوس خداؤں کے حضور میں سرِ نیاز جھکا کر وہ روحانی کیف و سرور حاصل کرے جو مذہب کا اصل مدعا ہے۔ جو روحانی لذت ایک شخص ذاتِ حق کو پیکرِ محسوس میں جلوہ گر دیکھ کر حاصل کر سکتا ہے وہ ایک اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح لوگ خدا پرستی سے ہٹ کر انسان پرستی میں مبتلا ہوئے۔

انسان کی حیلہ جو فطرت نے بھی اکابر پرستی کے مسلک کو ہمیشہ تقویت پہنچائی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا راستہ چونکہ حق اور صداقت کا راستہ ہوتا ہے، جس کے نتائج اس دنیا کی سرحد کو عبور کر جانے کے بعد ہی سامنے آتے ہیں، اور انسان کو عمر بھر باطل کے خلاف نبرد آزما رہنا پڑتا ہے، اس لیے انسان نے حق کے اس کٹھن اور دشوار راستے سے گریز کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا کہ ان بزرگ اور بلند تر ہستیوں اور عام انسانوں کے درمیان چونکہ ایک جوہری فرق ہے اس لیے وہ ان کی پیروی کے مکلف ہی نہیں۔ ان کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ ان کے مقامِ اُلوہیت کا صدقِ دل سے اعتراف کریں اور ان کے نام پر کچھ نذر نیاز دے کر یا ان کی تعریف و توصیف میں کچھ کلمات کہہ کر مطمئن ہو جائیں اور زندگی کے معاملات میں جس طریقے کو مادی اعتبار سے نفع مند سمجھیں اس پر چلتے رہیں۔ جن لوگوں کے مزاج پر مذہبیت زیادہ غالب تھی اور جنہیں دنیاوی علائق سے نفرت تھی اور وہ پوری زندگی ان بزرگوں کے

ساتھ روحانی ربط قائم رکھ کر بسر کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اُن کے تصوّر میں اپنے آپ کو یکسر کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دین دار لوگ دنیاوی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو گئے اور ان کی اس خود فراموشی سے طالع آزما دنیا داروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پُوری طرح ملحوظ خاطر رہے کہ لوگوں نے خدا کے ان نیک بندوں کی جو پرستش شروع کی تو اس کے لیے خود ان بزرگوں نے انہیں اس غلط کام کی قطعاً ترغیب نہ دی تھی۔ اس میں سراسر قصور ان لوگوں کا تھا جو اپنی روحانی تسکین و تشفی کے لیے کسی معبودِ مشہود کے طلبگار رہتے۔ چنانچہ انہوں نے جب اپنے معاشرے میں اپنے سامنے ایسے مقدس حضرات پائے جو فکر و نظر، جذبہ و احساس اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بحرِ ظلمات میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے تو انہوں نے اپنے دلوں کی تاریکیاں دُور کرکے اس نُور کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے بجائے، اس نور کو معبود سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی اور جس شخص نے بھی انہیں ان کی اس غلطی پر ٹوکا اس کے درپے آزار ہو گئے اور اسے بزرگوں کا دشمن سمجھ کر اُس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

خدا کے یہ پاکباز بندے اگر عوام الناس سے اپنی خدائی کا سکہ منواتے تو انہیں اتنی دقت پیش نہ آتی جتنی کہ انہیں خداوند تعالیٰ کی کبریائی تسلیم کروانے، اور اپنے آپ کو معبودِ حقیقی کے بندے اور اُس کے رسول منوانے میں پیش آئی۔ باری تعالیٰ کو پیکرِ محسوس میں جلوہ گر دیکھنے والے انسانوں کے لیے یہ قطعاً مشکل نہ تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت اپنے معبودوں کی فہرست میں دو چار مزید خداؤں کا اضافہ کر لیتے۔

مذہب میں اس طرز کا جو بگاڑ پیدا ہُوا اس کی ذمہ داری کسی طرح خدا کے ان پاک بندوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ لیکن جب مقدس ہستیاں دنیا سے رخصت ہوئیں تو معاشرے میں ان کے اعلیٰ و ارفع مرتبہ کو دیکھ کر، بعض دنیا داروں نے بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر، ان کی جگہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ ان کے پیشِ نظر ان حضرات کی غیر معمولی عزت و احترام سے فائدہ اٹھا کر عوام میں اپنی خدائی قائم کرنا تھا اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو گمراہی اور ضلالت کے راستے پر ڈال

دیا اور مذہب اور تقدیس کے نام پر لوگوں کو دل کھول کر لوٹا۔ انہوں نے اپنی غلط اور خلافِ مذہب حرکات کو صحیح اور برحق ثابت کرنے کے لیے تعلیمات الٰہی میں عجیب و غریب تحریفات کیں اور مذہب میں بعض ایسی بدعات کو فروغ دیا جنہوں نے اس کے پورے نظام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس ناپاک مہم میں دنیا دار علماء، دنیا پرست صوفیاء اور طالع آزما سیاست داں سبھی شامل تھے۔ انہوں نے مذہب کے اندر جتنا وسیع بگاڑ پیدا کیا اس کی نوعیتیں اتنی لاتعداد ہیں کہ ان صفحات میں اُن سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ لیکن جب ایک انسان ان پر غور کرتا ہے تو وہ یہ بات بآسانی سمجھ لیتا ہے کہ ان سب کے پیچھے دوسرے ناپاک جذبات کے علاوہ جو جذبہ سب سے زیادہ مؤثر طور پر کارفرما رہا ہے وہ ایک ہی تھا کہ کسی طرح نظامِ مذہب میں نبی اور رسول کو جو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اُسے ختم کر کے اُس کی جگہ خود سنبھال لی جائے اور جب لوگ اُس کی اطاعت کے کسی حد تک خوگر ہو جائیں تو پھر اُن سے بندگی کا مطالبہ کیا جائے۔

رابطۂ عالمِ اسلامی

خلیل احمد حامدی

رابطہ کی تاسیس رابطۂ عالمِ اسلامی (مسلم ورلڈ لیگ) کا قیام آج سے صرف چار سال قبل عمل میں آیا ہے۔ اس کی تشکیل کے لیے جو نہج اختیار کیا گیا تھا اُس نے پہلے ہی روز اس کے خوش آئند مستقبل کی بشارت دے دی تھی۔ مئی ۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ حج کے موقع پر ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں چار سو کے قریب مندوبین شریک ہوئے۔ مندوبین کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جنہیں ہم اسلام اور اسلامی دنیا کے حقیقی رہنما کہہ سکتے ہیں۔ پچھلے طویل عرصہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ گہوارۂ اسلام اور مہبطِ وحی میں، مختلف سیاسی اور اجتماعی نظریات کی کشاکش کے عین عروج میں، یہ اسلامی اجتماع حج کے مبارک ایّام میں منعقد ہُوا۔ اس کانفرنس میں بڑے آزادانہ طریقے سے اسلامی دنیا کے مسائل اور اسلامی دعوت کو فروغ دینے کی ضرورت پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ راقم السطور اس کانفرنس کا عینی شاہد ہے۔ رائے کے اظہار میں اس کانفرنس کے اندر جتنی آزادی برتی گئی ہے وہ اُس آزادی سے کم نہ تھی جو لاہور کے ۱۹۵۸ء کے انٹرنیشنل کلوکیم میں دیکھی گئی ہے۔ اس میں جو روح کام کر رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں شاہ سعود نے بے قابو ہو کر کہا تھا کہ "اب تو بعض عرب ملکوں کے اندر ہمارے نبی کا بھی تمسخر اڑایا جانے لگا ہے، اس صورتِ حال کے سامنے ہم کیسے صبر کر سکتے ہیں"۔ اس سہ روزہ کانفرنس نے دو عظیم نتائج کو جنم دیا: (۱) اسلامی دنیا کے لیے زندگی کے صحیح راستہ کی نشاندہی۔ (۲) ایک مضبوط ادارے کی تاسیس جو دنیا کو صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتا رہے۔ اس ادارے

کا نام کانفرنس نے "رابطہ عالم اسلامی" تجویز کیا، اور اس کے لیے ایک کانسٹی ٹیوشن اسمبلی منتخب کی جس کا فرض یہ تھا کہ وہ کانفرنس میں پیش کردہ خیالات کو سامنے رکھ کر رابطہ کا لائحۂ عمل تجویز کرے۔ اور اپنے ایک مضبوط سکرٹریٹ کے ذریعہ اس کی تنفیذ کرے۔

وہ خیالات جن سے رابطہ کا خمیر تیار ہوا مؤتمر نے جن خیالات کا اظہار کیا اور جو بعد میں رابطہ کے لیے رہنما اصول قرار پائے ان کا خلاصہ یہ ہے:

سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کے درمیان اصل رابطہ "اخوتِ اسلامی" ہے۔ اسلام کے ماسوا ہر عصبیت جاہلیت کی دعوت ہے۔ جو لوگ عرب قومیت کے بھیس میں اسلام کے فروغ کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں وہ عربوں کے بدخواہ ہیں، اخوتِ اسلامی کو جو شخص زد پہنچاتا ہے وہ عربوں کی تاریخ کو مسخ، عربوں کی قوت کو کمزور اور عرب اتحاد کو پارہ پارہ کرتا ہے۔ ایک ایسے جامعہ اسلامیہ[1] کے قیام کی شدید ضرورت ہے جو مسلمان ملکوں کے درمیان سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی تعاون کی راہیں ہموار کرے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے مسلمان سربراہوں کا اجتماع نہایت ناگزیر ہے[2]۔

اقتصادی میدان میں عدلِ اجتماعی کا فروغ صرف اسلام کے جامع اور عادلانہ قوانین کی تطبیق سے ہو سکتا ہے۔ اسلام طبقاتی کشمکش سے بری ہے۔ وہ فرد کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے اور لوٹ کھسوٹ کا بھی قلع قمع کرتا ہے۔ کمیونزم، سوشلزم اور بے لگام سرمایہ داری اسلامی نظامِ معیشت کے منافی ہیں۔

مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ معاشروں کو تمام غیر اسلامی مظاہر سے پاک کریں، مثلاً مے کشی، میخواری اور کاروبارِ مے، قحبہ گری، قمار بازی اور سود خواری اور اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں میں اسلامی احکام کی پابندی کریں۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی تاسیس اور نژادِ نو کی

---

[1] یعنی جامعۂ عربیہ (عرب لیگ) کے نہج پر جامعہ اسلامیہ وجود میں آنا چاہیے۔ یہ وہی دعوت ہے جسے جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبالؒ پیش کرتے رہے ہیں۔

[2] شاہ فیصل مسلم سربراہوں کی جو کانفرنس منعقد کر رہے ہیں وہ اسی مطالبہ کا جواب ہے۔

اسلامی تربیت کا انتظام کریں۔ مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، پریس، ریڈیو اور دیگر وسائل نشر و اشاعت کو مخالفِ اسلام پروگراموں سے ملوّث نہ کریں۔

مؤتمر کی نگاہ میں فلسطین صرف عربوں کا مسئلہ نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ اس کی آزادی کے لیے ایک مشترک سیاسی، عسکری اور اقتصادی تنظیم کی ضرورت ہے۔ الجزائر کو آزادی سے ہمکنار کرنے کے لیے اُس کی مادّی اور اخلاقی امداد جاری رکھنا تمام مسلمان حکومتوں اور مسلمان قوموں کا فرض ہے[1]۔ مسئلۂ کشمیر کا صحیح حل آزادانہ استصواب ہے۔ صحرائے بریمی کے بارے میں حکومت سعودی کا موقف حق پر مبنی ہے۔ جنوبی عرب اور عدن پر اصل حق یمن کا ہے۔ مسقط و عمان اور خلیج عربی کی مظلوم ریاستوں کو استعمار سے نجات پانے کے لیے جنگ جاری رکھنی چاہیے۔ مغربی ایریان انڈونیشیا کا جزوِ لاینفک ہے۔ مؤتمر اری ٹیریا کے مسلمانوں کی جنگِ آزادی کی تائید کرتی ہے اور مسلمان حکومتوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اقوامِ متحدہ میں اٹھائیں۔ حبشہ کی حکومت سے مؤتمر مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی مسلم رعایا کے ساتھ مساوات کا سلوک اختیار کرے اور انہیں اپنے مظالم کا نشانہ بنانے سے احتراز کرے۔ ہندوستان کی مسلم اقلیت وہاں کے ہندو نظام کی تیغ ستم کے نیچے تڑپ رہی ہے، یہ انتہائی قلق انگیز بات ہے۔ حکومتِ ہند کا فرض ہے کہ وہ مسلمان رعایا کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے قولاً نہیں عملاً مساوات کا برتاؤ کرے اور مسلمان بچوں پر ہندو مت کی تعلیم نہ ٹھونسے۔ کمیونسٹ ممالک میں مسلم اقلیتوں کے ساتھ جو سنگدلانہ برتاؤ کیا جا رہا ہے مؤتمر اس پر شدید احتجاج کرتی ہے اور تمام مسلمان حکومتوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ان مجبور و مقہور مسلمانوں کے تحفظ کی کوشش کریں۔ کمیونزم کی تحریک اسلامی ممالک کے لیے شدید خطرہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ یہ تحریک "دوستانہ تعلقات" اور "اقتصادی مساوات" کے پُرفریب لیبل کے تحت اسلامی ممالک میں فروغ پذیر ہے۔ اس کا اصل ہدف اسلامی معاشرے کی بیخ کنی اور اجنبی اقتدار کا تسلط ہے۔ افریقہ کے تمام آزاد ممالک اور خصوصاً

---

[1] الجزائر اس وقت تک آزاد نہیں ہوا تھا۔

اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ ممالک اقتصادی اور اجتماعی ترقی کے لیے جو دوڑ دھوپ کر رہے ہیں اس میں ان کو مدد دی جائے۔ مؤتمر توجہ دلاتی ہے کہ مسلم ممالک کے تجارتی اور کاروباری ادارے افریقہ کے ساتھ وسیع پیمانے پر تجارتی تعلقات استوار کریں تاکہ اسرائیل کے بڑھتے ہوئے نفوذ کا سدِّباب کیا جا سکے جو کاروبار کے بھیس میں ان ممالک کو ازسرِ نو استعمار کا شکار بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

یہ ہے اُن خیالات کا نچوڑ جو اس کانفرنس میں پیش کیے گئے۔ اور یقیناً قارئین کی خوشی میں اضافہ ہوگا اگر میں یہ عرض کر دوں کہ یہ صرف مؤتمر کے خیالات ہی نہیں تھے بلکہ مؤتمر کی قراردادیں اور فیصلے تھے جن پر رابطہ کی نیو رکھی گئی۔

رابطہ کے مقاصد رابطہ کی مجلس تاسیسی نے اپنے پہلے اجلاس کے اندر رابطہ کے مندرجۂ ذیل مقاصد معین کیے: اسلام کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا۔ اسلامی نظریات و تعلیمات کی تشریح اور ان کے بارے میں پیدا شدہ شبہات کا ازالہ۔ اور اُن تمام سازشوں کا انسداد جو اعدائے اسلام مسلمانوں کو دین سے بھٹکانے اور اُن کی وحدت و اخوت کے رشتوں کو تار تار کرنے کے لیے مسلسل کر رہے ہیں۔ ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ تکالیف و مسائل کا جائزہ اور انہیں ملت کی آرزوؤں اور مصلحتوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش۔ اور یہ کوشش کہ تمام اسلامی ممالک کے اندر اسلام کی حکمرانی قائم ہو۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے رابطہ نے مختلف وسائل اختیار کیے ہیں۔ لیکن رابطہ کو سب سے بڑا جو وسیلہ میسر آیا ہے اور جس نے اس کی جڑوں کو خاصا گہرا کر دیا ہے وہ حج کا اجتماع ہے۔ رابطہ نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر سال حج کے موقع پر رابطہ کا سکرٹریٹ نمایاں حجاج کو منتخب کر لیتا ہے اور "تقریبِ تعارف" کے عنوان سے ان کا اجتماع منعقد کرتا ہے جس میں ہر شخص اپنے حالات اور مسائل دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور دوسروں کے حالات و مسائل سے آگاہ ہوتا ہے۔ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ تعارفی اجتماع بڑا

نتیجہ خیز رہا ہے۔ دوسری تنظیمیں بے پناہ مصارف کے باوجود اپنی دعوت اُن حلقوں کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچا سکتیں جن حلقوں تک رابطہ حج کے قدرتی اجتماع سے بآسانی پہنچا دیتا ہے۔ اور ایسے وقت میں پہنچاتا ہے جب کہ کان سننے کے لیے نہ صرف تیار بلکہ بے تاب ہوتے ہیں اور دل اسے جذب کرنے کے لیے شوق سے لبریز ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ پیشین گوئی بڑے یقین اور بصیرت سے کی جا سکتی ہے کہ رابطہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ یہ مستقبل قریب میں بہت بڑی اسلامی قوت بن کر اُٹھے گا۔

رابطہ کی خدمات | چار سال کا عرصہ کوئی اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہے کہ کسی تنظیم کے کامیاب و ناکام ہونے کا حکم لگایا جا سکے۔ عام حالات میں چار سال کے اندر ایک تنظیم صرف اپنے قویٰ کو مجتمع ہی کر سکتی ہے۔ عملی اقدامات تو بعد کی بات ہے لیکن رابطہ کی چار سالہ کارگزاری کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ رابطہ نے توقعات سے بہت زیادہ کام کیا ہے۔ رابطہ کی کارگزاری پر تفصیل سے روشنی ڈالنا اس وقت ممکن نہیں ہے۔ البتہ ہم چند باتوں کا مجملاً ذکر کیے دیتے ہیں۔

قرآن کریم کے تراجم | رابطہ نے سب سے زیادہ قابلِ قدر جو خدمت سرانجام دی ہے وہ قرآنِ کریم کے ترجموں کی تقسیم و اشاعت ہے۔ علامہ اسد نے قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کی تکمیل رابطہ کی سرپرستی اور تائید میں کی ہے۔ رابطہ یہ ترجمہ اسلامی اداروں اور تنظیموں کو مفت فراہم کر رہا ہے اور عام حاجتمندوں کو نصف قیمت پر مہیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے قرآن کریم کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ فرانسیسی زبان کے علماء نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ رابطہ نے اس ترجمے کے تین ہزار نسخے خریدنے اور پھیلانے کا پروگرام طے کیا ہے۔ اسی طرح حال ہی میں فارموسا کے بعض مسلمانوں سے یہ معلوم ہوا کہ چینی زبان میں قرآن کریم کا ایک ایسا ترجمہ دریافت ہوا ہے جو موجودہ ترجمہ سے بہت بہتر اور صحیح ہے۔ رابطہ نے اس ترجمہ کی طباعت کے پورے مصارف ادا کیے اور یہ ترجمہ اب چین، ملائشیا، فلپائن اور تھائی لینڈ میں تقسیم ہو رہا ہے۔ جاپانی زبان میں

قرآن کریم کا ترجمہ جاپان کے نامور نومسلم الحاج عمر میتا (MARMITA) نے کیا ہے۔ موصوف نے طویل عرصہ تک مکہ معظمہ میں رابطہ کے حساب پر مقیم رہ کر اس ترجمہ کی تکمیل کی ہے۔ یہ ترجمہ اب طباعت و اشاعت کے مرحلوں میں ہے۔ جاپان میں اسلام کے فروغ کے نہایت وسیع امکانات ہیں، یہ ترجمہ ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے سب سے کارگر اور پائدار وسیلہ ہو گا۔

دعوتِ اسلامی کا کام اس سلسلے میں رابطہ نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ دنیا کی اسلامی تنظیموں اداروں اور مرکزوں سے ربط قائم کیا ہے۔ اور مختلف تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں یہ کہ دعوتِ اسلامی کی ترقی کے لیے اُن سے تعاون کیا ہے، باصلاحیت افراد کو منظم کیا ہے۔ اور ضروری وسائل فراہم کیے ہیں مختلف ملکوں میں اپنی طرف سے نئے سنٹر جاری کیے ہیں۔ مثلاً کیمرون کے دارالحکومت یوندا میں ایک اسلامک سنٹر کھولا گیا ہے اور ابتدائی مرحلے میں اُس پر تین ہزار پونڈ صرف کیے گئے ہیں۔ مشرقی نائیجیریا میں ایک اسلامک سنٹر جاری کیا گیا ہے جسے دس ہزار ریال کی ماہانہ امداد دی جارہی ہے۔ اس مرکز کے تحت ایک اسپتال، ایک دینی مدرسہ اور ایک لائبریری قائم کی جائے گی۔ ابیبی (نائیجیریا) کے اسلامی ٹریننگ کالج کو رابطہ کی طرف سے سو پونڈ ماہانہ کی گرانٹ دی جارہی ہے۔ ایلی جو مغربی نائیجیریا کا مشہور شہر ہے، وہاں کے اسلامی مدرسوں میں رابطہ نے اپنے خرچ پر عمارات تعمیر کروائی ہیں۔ شمالی نائیجیریا کے مرحوم وزیر اعظم الحاج احمد و بیلو رابطہ کی مجلس تاسیسی کے رکن تھے، انہوں نے نائیجیریا میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے جن جن اداروں کے قیام کی تجویز کی رابطہ نے اُن سے بھرپور تعاون کیا، اور ساٹھ ہزار پونڈ تک کی مدد دی ہے۔ اسی طرح امریکہ اور شمالی افریقہ میں بھی رابطہ کے منصوبے رُو بعمل لائے جارہے ہیں۔ امریکہ کے رنگدار مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم اور اقامتِ صلوٰۃ کے انتظام کے لیے رابطہ کی طرف سے ایک مستقل مبلّغ بھیجا گیا ہے۔ افریقہ کے مختلف حصّوں میں رابطہ کی طرف سے مبلّغین کی جماعتیں گئی ہیں۔ اور ہزاروں انسانوں کو حلقہ بگوش اسلام ہونے کی سعادت بخشی گئی ہیں۔ سعودی ریڈیو سے بھی رابطہ نے روزانہ آدھ گھنٹہ کا وقت حاصل کر

رکھا ہے اور عربی زبان میں دعوتی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

اس ضمن میں رابطہ نے جن اسلامی اداروں کی ماہانہ، یا سالانہ یا یکمشت مدد کی ہے اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن چند ایک کا ذکر ضروری ہے تاکہ رابطہ کے کام کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکے۔ یہ تمام کے تمام وہ ادارے ہیں جو ماہانہ یا سالانہ امداد لے رہے ہیں۔

۱۔ اسلامک سنٹر جنیوا

۲۔ مؤتمر عالم اسلامی، کراچی

۳۔ جماعت غربائے اہلحدیث، کراچی

۴۔ مؤتمر اسلامی، بیت المقدس

۵۔ اسلامک سنٹر لنکا

۶۔ جمعیت انصار سنت محمدیہ مقدیشو جوبالی لینڈ

۷۔ ندوۃ العلماء لکھنو، ہندوستان

۸۔ مؤتمر تحفظ قرآن، سوڈان

۹۔ اسلامک سنٹر فلپائن

۱۰۔ جمعیت ابنائے شہداء، اردن

۱۱۔ کامل الاسلام کالج، فلپائن

۱۲۔ اسلامک سنٹر بروکسل

۱۳۔ مسلم سٹوڈنٹس انجمن مغربی جرمنی

۱۴۔ اسلامی یونیورسٹی، مکاسر، انڈونیشیا

۱۵۔ انجمن اشاعت اسلام ٹوکیو، جاپان

۱۶۔ چائنا اسلامی انجمن، فارموسا

۱۷۔ انجمن اصلاح بنکاک، تھائی لینڈ

طلبہ میں دعوت کا کام طلبہ میں غیر اسلامی تنظیموں نے عالمی پیمانے پر بڑا دسیع الاثر کام کیا ہے ان کے مقابلے میں دنیا کی اسلامی تنظیموں نے اس طرف۔ باستثنائے چند۔ خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ رابطے نے طلبہ کی مختلف تنظیموں میں اتحاد کو پروان چڑھانے، انہیں دین سے آگاہ کرنے اور انہیں منظم کرنے کی خاطر ۱۹۶۴ء میں حج کے موقع پر اُن کی بہت بڑی تعداد کو اپنے خرچ پر جمع کیا۔ اُن میں سے ۷۰ طالب علم مغربی یونیورسٹیوں سے بلائے اور ۵۰ طالب علم افریقہ سے۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء کے حج کے موقع پر دنیا کے مختلف حصوں سے ۲۴ طالب علموں کو مدعو کیا۔ ان طلبہ نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ رابطہ نے علماء کے مختلف گروہوں کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ طلبہ کے عرصۂ قیام کے دوران اُن کے سامنے اسلامی موضوعات پر لیکچر دیں۔ رابطہ کی یہ اسکیم نہایت درجہ موثر رہی۔ راقم السطور مذکورہ دونوں سالوں میں خود حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں مقیم تھا۔ اور طلبہ کو خطاب کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ ان طلبہ میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اسلامی ممالک کے رہنے والے تھے اور مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی غرض سے گئے ہوئے تھے اور ایک تعداد ایسے طلبہ کی بھی تھی جو نومسلم تھے۔ یہ طلبہ جب واپس اپنے مقامات کو لوٹ رہے تھے تو ان کے دل و دماغ اسلامی جذبات سے پوری طرح لبریز تھے۔ اسلام کی ایک نئی لگن ان کے سینوں میں مشتعل تھی، مغربی تہذیب کے پُرفریب مظاہر ان کی نظروں میں اپنی وقعت کھو چکے تھے۔ یہ لوگ جب واپس پہنچے ہوں گے تو کیا ان روحانی فوائد کو نیاگ کر بیٹھ گئے ہوں گے؟ نوجوان خون کے بارے میں یہ گمان درست نہیں ہو سکتا یقیناً انہوں نے اسلام کا غلغلہ بلند کیا ہوگا اور یقیناً اپنے محسن رابطہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہوگا۔ اس کارِ خیر میں رابطہ کا جس قدر حصّہ ہے اُسی قدر حصّہ اسلامک سنٹر جنیوا کا ہے۔ جس نے یہ اسکیم تیار کی۔ طلبہ سے ربط قائم کیا۔ اور باصلاحیت طلبہ کی عظیم الشان ٹیم رابطہ کی جھولی میں لا ڈالی۔

اسلامی پریس کی پشت پناہی دُنیا میں اسلامی پریس کی مثال اس بدقسمت بچے کی سی ہے جو باپ کے جیتے جی یتیم ہو۔ باطل تحریکوں نے پریس کی طاقت سے دنیا پر جھوٹ کو بھی سچ کر دکھایا ہے مگر مسلمان اس طاقت سے فائدہ نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے صحیح کو بھی صحیح منوانے سے قاصر ہو رہے ہیں

رابطہ نے اس معاملے میں زرّیں مثال پیش کی ہے۔ اور اسے حقیقی داد بھی دی جائے کم ہے۔ راقم السطور کے ذاتی علم کی بنا پر رابطہ اس وقت دنیا کے متعدد اسلامی مجلّات و اخبارات کو معقول مالی امداد دے رہا ہے تاکہ یہ اسلامی ترجمان اپنے معاصروں کے سامنے سرِ فخر بلند کر سکیں اور اسلامیت کی آبرو کو مجروح نہ ہونے دیں۔ اس امداد کے بدلے میں رابطہ کی طرف سے صرف ایک مطالبہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "اسلام کو اس کے حقیقی مفہوم کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے"۔ اسلامی پریس کو مدد دینے کی ایک یہ شکل بھی رابطہ نے اختیار کر رکھی ہے کہ رابطہ کا سکرٹریٹ اخبارات اور رسالوں کو خرید لیتا ہے اور پھر اسے اہلِ علم تک اور ضرورت مند حلقوں تک اپنے خرچ پر مفت پہنچاتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب، اردن، شام، لبنان، الجزائر، مراکش، سوڈان اور ہندوستان سے کئی پرچے سکرٹریٹ میں پہنچتے ہیں اور شعبۂ تقسیمِ کتب کی طرف سے دنیا کے اطراف میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔

اسلامی لٹریچر کی اشاعت | اپنے اعلان کی رُو سے رابطہ کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے طور پر اسلامی کتب تیار کرواتا اور اُسے اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع کر کے پھیلاتا۔ مگر اب تک رابطہ یہ نہیں کر پایا۔ البتہ دوسرے مصنّفین کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں خرید کر رابطہ تقسیم کر رہا ہے۔ عربی، انگریزی اور فرنچ میں اسلام کے مختلف موضوعات پر ان گنت کتابیں پھیل چکی ہیں اور ایک بہت بڑی کھیپ دفتر میں تقسیم کی منتظر پڑی ہے۔

رابطہ کے میگزین | رابطہ کے سکرٹریٹ سے اس وقت دو ماہانہ آرگن نکل رہے ہیں۔ ایک عربی میں اور دوسرا انگریزی میں۔ جہاں تک دونوں ماہناموں کے ظاہری حسن و جمال اور زینت و آرائش کا تعلق ہے بلاشبہ یہ ماہنامے عمدہ اور جاذبِ نظر ہیں مگر مضامین کا معیار اور انتخاب بہت حد تک توجہ کا مستحق ہے۔ خاص طور پر انگریزی پرچے میں بعض ایسے مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں جن سے خود رابطہ کے مقاصد کی نفی ہوتی ہے۔ اور صاف ستھرے خیالات کے بجائے ان میں اُلجھے ہوئے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ بات نہایت قابلِ ستائش ہے کہ ان پرچوں

پر سوائے ڈاک خرچ کے اور کوئی چندہ نہیں لیا جاتا۔ اگر ان کا معیار بھی بلند ہو گیا تو یہ اسلامی تحریکوں کا نقطۂ ماسکہ بن جائیں گے۔ رابطہ کے دونوں میگزینوں کے نگران بڑے فاضل اور باہمت بزرگ ہیں۔ عربی میگزین کے چیف ایڈیٹر شیخ ابراہیم شوریٰ ازہر کے فارغ ہیں۔ دعوت و تبلیغ کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح سنگاپور کے انگریزی میگزین کے انچارج جناب ابراہیم سقاف اس کوچہ کے پرانے رازدانوں میں سے ہیں۔ اس لیے ان کے معیاروں کا بلند ہونا ناممکن نہیں ہے۔

لائبریری | وہ مقدس مقام جسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم نے تین سال تک دعوتِ اسلامی کا خفیہ مرکز بنائے رکھا، جہاں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے قبول اسلام کا اعلان کیا، اور جو آج بھی دارِ ارقم کے نام سے مشہور ہے، وہاں رابطہ نے لائبریری قائم کر دی ہے اس لائبریری میں کتابوں کا ذخیرہ جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اور امید ہے کہ چند برسوں کے بعد یہ اعلیٰ معیار کی لائبریری بن جائے گی اور تحقیق و جستجو اور علم و عرفان کے پیاسوں کے لیے چشمۂ شیریں ثابت ہو گی۔ جہاں کتابیں علم کی رونق فراہم کریں گی، وہاں حرم کا نورانی ماحول ایمان واذعان کے ازدیاد کا موجب ہو گا۔

اصلاحاتِ حج | وسائل و ذرائع کی ترقی اور حجاج کی تعداد میں روز افزوں اضافے کا تقاضا تھا کہ حج کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں۔ موجودہ نظام تقریباً آج سے ۲۵-۳۰ سال قبل کا ہے۔ رابطہ نے اس موضوع پر بھی خاصا کام کیا ہے۔ رابطہ کی مجلس تاسیسی نے حکومت سعودی کے سامنے معلّمین کی تنظیم و تربیت اور دوسرے مسائل کے بارے میں اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں۔ چنانچہ ان تجاویز میں سے تین پر حکومت کی طرف سے عملدر آمد کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ ایک معلّمین کے نظام کی اصلاح جس کی رُو سے معلّمین کی ٹھیکیداری ختم کی جا چکی ہے اور حاجیوں کو آزاد کر دیا گیا ہے کہ وہ جس معلم سے چاہیں اپنا معاملہ طے کر لیں۔ دوسری یہ کہ مقامِ ابراہیم پر جو قبہ قائم ہے اُسے گرا کر پتھر کو آدھا زمین دوز کر دیا جائے اور آدھے پر ایسے شیشے کا خول چڑھا دیا جائے جو ٹوٹ نہ سکے اور جس کے اندر پتھر کو دیکھا جا سکے اور تیسری

یہ کہ حج کے ایام میں رابطہ کی طرف سے حرم شریف کے اندر مختلف زبانوں میں حج کے فضائل و مناسک پر تقریریں کی جائیں۔ ان کے علاوہ چند اور بھی اصلاحی تجویزیں زیر غور ہیں۔ امید ہے کہ سعودی حکومت انہیں بھی امکانی حد تک نافذ کردے گی

اتحاد اسلامی اس عنوان پر مستقل بحث کی ضرورت نہ تھی۔ مگر چونکہ یہ لفظ ("اتحاد") رابطہ کا سلوگن قرار پا چکا ہے اس لیے اس پر بعض پہلوؤں سے کلام کرنا مفید رہے گا۔ اسلامی اتحاد کے لیے رابطہ نے بڑی حکمت اور منطقی ترتیب سے کام کیا ہے۔ ہم نے اس پہلو پر جتنا غور کیا ہے اس پر ہمیں رابطہ کے قائدین کی دانشمندی کا معترف ہونا پڑا ہے۔ بلکہ ہمارا ناقص مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ماضی قریب میں اس دانشمندی کا ثبوت سب سے پہلے رابطہ ہی نے دیا ہے۔

رابطہ کی سعی اتحاد کی پہلی منزل یہ تھی کہ اُس نے اُن تمام مخلص افراد کو جمع کیا جو دنیا کے اندر اسلام کے احیاء کا کام کر رہے ہیں۔ ان افراد سے ایک اسمبلی کی تشکیل کی اور ان کے علم و تجربہ کو رُوبکار آنے کا موقع فراہم کر دیا۔ رابطہ کی یہ اسمبلی پہلے سال ۲۱ افراد پر مشتمل تھی اور اس میں سعودی عرب، نائیجیریا، سنی گال، پاکستان، ہندوستان، فلسطین، مصر، یمن، شام، الجزائر، افغانستان، مراکش، موریطانیہ، سنگاپور، عراق، فلپائن، لنکا، اردن اور سوڈان کو نمائندگی حاصل تھی۔ اور جو مسلمان ممالک اور مسلمان آبادیاں رہ گئی تھیں اُن کے لیے دروازہ کھلا رکھا گیا اور بعد میں رفتہ رفتہ نمائندگی کی تکمیل ہوتی رہی۔ دو سال تک یہ عمل جاری رہا۔ یہ نمائندے عوامی حیثیت کے تھے سرکاری حیثیت کے نہیں تھے۔ یہ جب ایک میز پر جمع ہوئے تو انہیں محسوس ہُوا کہ دنیا کے اندر اسلام بہت بھاری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ مگر باہمی تعاون و تفاہم معدوم ہونے کی وجہ سے یہ طاقت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی۔ اور اب رابطہ کے پلیٹ فارم نے اس کسر کو پورا کر دیا ہے۔ اس کے بعد رابطہ نے ایسے افراد کو بھی شامل کرنا شروع کر دیا جن کی حیثیت سرکاری تھی۔ رابطہ کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت ایک ایسا اصول ہے جس پر عوامی نمائندوں اور سرکاری نمائندوں کو باہمی اختلاف کے باوجود متحد ہو جانا چاہیے۔

اتحاد کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ رابطہ نے دنیا کی اسلامی تنظیموں کے ساتھ روابط پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ اور اُن میں سے عالمی تنظیموں کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے بجائے ایک نظام میں متحد ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ مؤتمر اسلامی فلسطین اور مؤتمر اسلامی کراچی کو پیش کش کی کہ وہ رابطہ سے مل جائیں۔ اور یہ تینوں ادارے ایک ہو جائیں۔ رابطہ کی یہ اسکیم بھی ایک حد تک کامیاب رہی۔ ان دونوں مؤتمروں نے اپنا الگ الگ وجود تحلیل تو نہ کیا لیکن رابطہ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے کام میں متحد ہو گئیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ کے جتنے پہلو ہو سکتے تھے وہ ختم کر دیئے اور اتحاد و تعاون کے رشتے مضبوط کر لیے۔ یہ تینوں ادارے تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں۔

اب تیسرا مرحلہ حکومتوں کے اتحاد کا ہے۔ رابطہ نے ۶۵ء میں مکہ معظمہ میں جو اسلامی کانفرنس منعقد کی تھی وہ گویا تیسرے مرحلے کا آغاز تھا۔ اس کانفرنس میں رابطہ نے یہ دعوت پیش کی کہ مسلمان سربراہ جمع ہوں اور مسلمان قوموں کی ترقی، مسلمان قوموں کے سیاسی مسائل اور مسلمان ممالک کے باہمی اتحاد کے امکانات سوچیں۔ چنانچہ سعودی عرب کے حکمران فیصل بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے اس دعوت پر لبیک کہا اور یہ اعلان کیا کہ وہ مسلمان سربراہوں کی کانفرنس بلائیں گے۔ موصوف اس سال حج کے موقع پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مسلمان ملکوں کے دورے کر رہے ہیں اور مسلمان سربراہوں کو آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ خالص اسلامی بنیادوں پر ایک جگہ جمع ہوں۔ ظاہری علامات سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ فیصل اس کانفرنس کے انعقاد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگرچہ عرب قومیت کے علمبردار اور کمیونسٹ یا کمیونسٹوں کے ہم سفر حلقے اس کانفرنس کی شدت سے مخالفت کر رہے ہیں۔

رابطہ کا سکرٹریٹ رابطہ کی روح رواں اور کرتا دھرتا شیخ محمد سرور الصبان ہیں۔ موصوف رابطہ کے جنرل سکرٹری ہیں۔ سعودی عرب کے سابق وزیر خزانہ ہیں۔ رابطہ جن مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوا ہے اُن میں بڑی حد تک موصوف کی دلچسپی کو دخل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

کہ شیخ محمد سرور الصبان اور رابطہ میں لازم و ملزوم کا رشتہ قائم ہو چکا ہے بلکہ مکہ مکرمہ کے کسی باشندے سے اگر یہ دریافت کیا جائے کہ رابطہ کا دفتر کہاں ہے تو وہ اکثر و بیشتر لاعلمی کا اظہار کرے لیکن اگر یوں پوچھا جائے کہ "فین مکتب حق الشیخ محمد سرور؟" تو وہ فوراً جواب دیگا "القصر" (شاہی محل میں)۔ موصوف بڑے علم دوست ہیں۔ اپنے دورِ وزارت میں مبتلیہ سعودی ادباء اور اربابِ صحافت کی سرپرستی کی ہے۔ اپنے محل میں ادباء و شعراء کی محفلیں منعقد کی ہیں، داد و دہش سے ان کی پذیرائی کی ہے۔ اور متعدد علمی اور تاریخی کتابوں کو اپنے خرچ پر طبع کرایا ہے۔

اب رابطہ کے سکرٹریٹ کو بڑے سلیقہ سے چلا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری جو مخلص ترین شخصیت کام کر رہی ہے وہ شیخ صالح قزاز ہیں۔ جو رابطہ کے ڈپٹی سکرٹری ہیں۔ اور حرم شریف کی تعمیرات کے بھی انچارج ہیں۔ بڑے نیک نفس اور خدا ترس انسان ہیں۔ اور رابطہ کے لیے سراسر برکت ہیں۔ رابطہ کے ڈائرکٹر یا آفس سپرنٹنڈنٹ، استاذ حسین سراج ہیں۔ بڑے زیرک اور عالم فہم ہیں۔ انگریزی زبان و ادب کے عالم ہیں۔ شعر و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ رابطہ کی رپورٹوں کو ادبی چٹخاروں کے ساتھ پیش کر کے خشک سے خشک موضوع میں بھی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تکلفات سے بری ہیں۔ شیخ محمد سرور صبان کے دستِ راست ہیں۔

راقم السطور رابطہ کے سکریٹریٹ میں تقریباً ایک سال تک کام کر چکا ہے۔ سکرٹریٹ روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ اس وقت مندرجہ ذیل شعبے کام کر رہے ہیں: سکرٹری۔ ڈپٹی سکرٹری ڈائرکٹر۔ شعبۂ مالیات۔ شعبۂ اوراق (ٹائپ اور ڈاک کی وصولی اور روانگی کا ریکارڈ رکھنے کا شعبہ)، شعبۂ تقسیم کتب، شعبۂ تنظیمات اسلامیہ (جس میں دنیا کی اسلامی تنظیموں اور انجمنوں سے متعلق معلومات جمع ہیں)، شعبۂ اقلیات اسلامیہ۔ شعبۂ محفوظات (اہم دستاویزوں اور پچھلے ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کا شعبہ)، شعبۂ مجلسِ تاسیسی و مؤتمرات (مجلس تاسیسی کے ارکان اور مؤتمرات سے ربط قائم رکھنے کا شعبہ۔ عربی میگزین برانچ۔ انگلش میگزین برانچ۔ لائبریری۔ ادارۂ تعلیمات اسلامیہ (یہ ایک مستقل اور نہایت اہم شعبہ ہے۔ اس کا کام مسلمان ملکوں

کے اندر اسلامی نظامِ تعلیم کا فروغ ہے۔ اس کی سرپرستی علماء و مفکرین پر مشتمل ایک اسٹیڈنگ بورڈ کرتا ہے۔

اس وقت رابطہ کی تمام رونق سکرٹریٹ سے قائم ہے۔ اگر سکرٹریٹ مزید چست و چالاک اور مخلص و محنتی ہوگا اُسی قدر یہ تحریک ترقی کرتی جائے گی۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ شکوہ ہو کہ فیصلوں کو نافذ کرنے میں سکرٹریٹ نے تساہل سے کام لیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ تساہل نہیں بلکہ اس کے دو بڑے سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مالیات بہرحال محدود ہیں جبکہ رابطہ کے فیصلے ایک اچھی خاصی ریاست کا میزانیہ چاہتے ہیں۔ دوسرے تجربہ کی کمی۔ اسلامی تحریک کے کام کے لیے تجربہ کسی لگے بندھے کورس کو پورا کرنے سے نہیں ملتا۔ بلکہ خود اس کام کے اندر کود جانے سے ہوتا ہے۔ ابتدائی مراحل ایسے آتے ہیں جب کہ خوبیوں سے زیادہ خامیاں ہوتی ہیں مگر بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جب تجربہ کا دور گزر جاتا ہے تو پختہ کاری پیدا ہو جاتی ہے۔ رابطہ کا سکرٹریٹ اس وقت تجربہ کے مرحلہ میں ہے۔

رابطہ اور پاکستان رابطہ نے کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کی ہمیشہ مکمل حمایت کی ہے بلکہ عرب ممالک کے اندر رابطہ پہلی واحد تنظیم ہے جس نے کھل کر کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی تائید کی ہے۔ رابطہ کے نزدیک کشمیر کے مسئلے کا صحیح اور منصفانہ حل آزادانہ رائے شماری ہے۔ حالیہ بھارتی حملے کے موقع پر رابطہ نے نہ صرف خود پاکستان کا پورا پورا ساتھ دیا ہے، بلکہ دوسرے مسلمان سربراہوں کو تاریں دے کر ان سے پاکستان کی حمایت کی اپیل کی ہے۔ امداد و تعاون کے وہ تمام وسائل اختیار کیے ہیں جو رابطہ کے بس میں تھے۔

(بشکریہ مسلم نیوز انٹرنیشنل، کراچی)

مطبُوعات

تعلیم کا مسئلہ مُرتبہ: جناب ظہور احمد، جناب ممتاز احمد، اور جناب عارف الحق۔ شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات جمعیت ۲۳۔ اسٹریچن روڈ، کراچی۔

پاکستان میں نظامِ تعلیم نے آج جو متعدد مسائل پیدا کیے ہیں اُن کے بارے میں مختلف اصحابِ فکر کی بیش قیمت آرا اس مجموعہ کی زینت ہیں۔ ان اصحابِ فکر میں ماہرینِ تعلیم، آزمودہ کار سیاست دان، تعلیم و تعلّم کا عملی تجربہ رکھنے والے اساتذہ کرام اور نامور قانون دان شامل ہیں۔ ان حضرات میں پروفیسر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین مرحوم، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر خواجہ محمد اسلم، مولانا امین احسن اصلاحی، چوہدری محمد علی، جناب نعیم صدیقی صاحب۔ جناب اے۔ کے۔ بروہی، جسٹس حمود الرحمٰن جسٹس اے۔ آر کارنیلیس اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے جن جن موضوعات پر اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن چونکہ اس مجموعہ کے مرتب کرنے والوں کا ذہن اسلامی ہے اس لیے اس مرقع میں ایک مقصدی ترتیب اور معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کے پس منظر، اس کے اندر بگاڑ کی مختلف صورتوں اور اُن کے اسباب، نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت، زبان اور نظامِ تعلیم، پاکستان میں رسم الخط کا مسئلہ اور تعلیم نسواں۔ الغرض تعلیم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق سیر حاصل بحث نہ کی گئی ہو۔ اس مجموعہ کا آغاز پروفیسر خورشید احمد صاحب کے گراں قدر مقالے "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم۔ ایک تاریخی جائزہ" سے اور اختتام اسلامی جمعیت طلبہ کی اُس فکر انگیز یادداشت پر ہوتا ہے جو ہمارے دردمند نوجوانوں نے تعلیمی کمیشن کے

سامنے پیش کی۔ یہ یادداشت بڑی موثر اور دلچسپ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب کے لیے اس کے فاضل مرتبین ملک کے دینی حلقوں سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ باری تعالیٰ ان کے عزائم اور ارادوں کو تقویت بخشے۔

معیارِ کتابت و طباعت اوسط درجے کا ہے۔ البتہ کتابت میں کچھ اغلاط رہ گئی ہیں۔

قیمت درج نہیں۔

آزمائش کی گھڑی تالیف جناب مسکین حجازی صاحب لیکچرار شعبۂ صحافت جامعہ پنجاب لاہور۔ ناشر: پاکستان کواپریٹو پبلشرز لاہور۔ صفحات ۲۷۴۔ قیمت چھ روپے بارہ آنے۔

گزشتہ سال بھارتی جارحیت کے مقابلے میں اہلِ پاکستان نے جس پامردی، جرأت، اتحاد و تنظیم اور جذبۂ ایثار کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ ایک مقدس یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا۔ فاضل مصنّف جناب مسکین حجازی صاحب نے زیرِ تبصرہ کتاب میں ایامِ جنگ کے واقعات تاریخ وار درج کیے ہیں۔ انہیں پڑھ کر ہمیں اپنی قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے اور ہم اس کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی بجائے علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں یہ یاد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

یہ ڈائری دلوں کو گرمانے کے علاوہ ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے مستقبل کا مؤرخ بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

طباعت اور کتابت کا معیار عمدہ ہے۔

گلبانگِ جہاد مرتبین: جناب شادانی، جناب قمر صدیقی، جناب حفیظ صدیقی اور جناب حفیظ الرحمٰن احسن۔ شائع کردہ: ایوانِ ادب۔ چوک اردو بازار، لاہور۔ صفحات ۲۱۶۔

قیمت ۲ روپے پچاس پیسے۔

گزشتہ ستمبر میں جب بھارت نے پاکستان کو دعوتِ مبارزت دی تو اسے نہ صرف ہمارے شیر دل عساکر نے پوری جرأت کے ساتھ قبول کیا بلکہ ہر طبقے نے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر اس کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہر طبقے کی صلاحیتیں پوری طرح اُبھر کر سامنے آگئیں۔ ملک کے سخنوروں نے بھی اپنا فرض پوری خوبی کے ساتھ سرانجام دیا اور شعر کے ذریعہ قوم کے اندر ایک ناقابلِ تسخیر ولولہ بیدار کیا۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی قسم کے اشعار کا ایک قیمتی مرقع ہے۔

ISLAM AND MODERNISM از محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ۔

شائع کردہ: جناب محمد یوسف خاں سنت نگر۔ لاہور۔ صفحات ۱۶۲ قیمت ۱۲ روپے۔

اس کتاب کی فاضل مصنفہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی ایک کتاب ISLAM VERSUS WEST اور مختلف علمی مضامین جو وقتاً فوقتاً ملک اور بیرونِ ملک کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں، اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب اُن کے فکر کی سلامتی اور مغربی تہذیب و تمدن کے گہرے مطالعہ کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب ۱۸ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مغربی مادیت کے فکری ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے، دوسرے باب میں فکرِ جدید اور اُس کی خصوصیات اور اُس کے نتائج کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرا باب بڑا فکر انگیز ہے اور اس میں بڑی دیدہ وری سے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا اسلام اور بیسویں صدی کے فکری رجحانات کے درمیان کوئی مصالحت ہو سکتی ہے؟ پھر اگلے صفحات میں محترمہ مریم جمیلہ نے سید امیر علی، سر سید احمد خاں، مصطفیٰ اتاترک، شیخ محمد عبدہٗ، ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور شیخ خالد محمد خالد کے افکار پر بڑی زوردار تنقید کی ہے اور مغرب کے مقابلے میں ان کی ذہنی مرعوبیت کی نقاب کشائی کی ہے۔

کتاب کے آخری ابواب میں اسلام اور عرب قومیت، اسلامی قومیت کے عناصر ترکیبی اور اُس کی خصوصیات، تاریخ اسلامی کے جائزے کی اشد ضرورت، ترقی کا نعرہ ہمارا سب سے بڑا دشمن۔ اسلام کی معذرت خواہانہ تعبیر کے نقصانات پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کے ایک ایک لفظ سے محترمہ مریم جمیلہ کا مومنانہ جوش و خروش اور مسلمانوں کو مغربی افکار و نظریات کی غلامی سے نجات دلانے کا ایک ناقابل تسخیر ولولہ ٹپکتا ہے۔
اس بیش قیمت کتاب کے مطالعہ کے دوران البتہ دو چیزیں ضرور کھٹکی ہیں۔ ایک شیخ محمد عبدہٗ پر اُن کی جرح۔ شیخ مرحوم و مغفور میں ہمیں تجدّد کا وہ رنگ نظر نہیں آتا جو سرسیّد اور اُن کے مقلدین کے ہاں پایا جاتا ہے۔ دوسری چیز مصنّفہ کی وہ تصویر ہے جسے کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ تصویر میں وہ بلاشبہ پردہ نشین ہیں لیکن اُن کے ٹھوس دینی خیالات اور رجحانات کے پیش نظر یہ باپردہ شبیہ بھی ذوق پر گراں گزرتی ہے۔

محترمہ مریم جمیلہ کے رفیقِ حیات جناب یوسف خاں صاحب نے اس کتاب کو نہایت ہی اونچے طباعتی معیار پر شائع کیا ہے اور یہ معیار اتنا عمدہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس معیار پر معدودے چند کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کا سلسلہ

از ابو سلیم محمد عبد الحیؒ

ایمان کی اہمیت

- ایمان کیا ہے؟
- دین میں ایمان کی کیا اہمیت ہے؟
- کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے؟
- دین کا شعور اور ایمان و یقین بخشنے والی کتاب
- بچوں اور عورتوں کے لیے نہایت مفید کتاب

قیمت ۲ روپے

اسلام کی تعلیم

- اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلامی عبادات کیسے انجام دی جائیں؟
- ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟

—— اس کتاب میں ——

اِن سوالوں کا اطمینان بخش جواب ملے گا

قیمت ۱/۷۵ روپے

دین کی حفاظت

- خواتین کی اصلاح و تربیت کیلئے بیش قیمت کتاب
- دین کی حفاظت و بقا کیلئے خواتین کی ذمہ داری
- فسادِ معاشرہ میں خواتین کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تدابیر

قیمت ۱/۷۵ روپیہ

دین کی خدمت

- دین کی خدمت کیوں کی جائے اور کیسے؟
- اس کام کی ضروری شرائط کیا ہیں؟
- غیر اسلامی نظام سے مومن کا تعلق۔
- اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کا حل۔
- آسان اور شگفتہ اندازِ بیان۔ قیمت ۲/۲۵ روپے

دین کی باتیں

- دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟
- اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلام کی بنیادی عبادات اور انکی ضروری تفصیلات
- آسان اور عام فہم زبان میں

قیمت ۲ روپے

تبلیغ کی حکمت

- تبلیغ کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟
- داعی کی ضروری صفات کیا ہیں؟
- مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیسے کیا جائے؟
- دعوتِ دین پیش کرنے کا سلیقہ؟

قیمت ۱/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

اِصلاح و تربیت کیلئے بے مثل کُتب

راہِ عمل

تالیف:- مولانا جلیل احسن ندوی

- مستند احادیثِ نبوی کا ایسا مختصر مجموعہ جو ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں رہنمائی کرے۔
- تعمیرِ سیرت کے لئے ایک بیش بہا خزینہ۔
- آفسٹ کی حسین طباعت، خوبصورت سرورق
- صفحات ۴۵۶ ہدیہ ۶.۰۰ روپئے

مسلمان کے روز و شب

از:- اسعد گیلانی

- ایک مسلمان کی زندگی کے لئے مفصل لائحہ عمل۔
- پاکیزہ زندگی گذارنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔
- صحابہ کرام اور صلحاء امت کی پاکیزہ زندگیوں کا عکس۔
- مسنون دعائیں اور عبادات۔
- قیمت صرف ۲.۲۵ روپئے

قرآن کی چار بنیادی اِصطلاحیں

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- الٰہ ۰ رب ۰ عبادت ۰ دین
- قرآن کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم اور ان کا انقلابی پہلو۔
- قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ایک ناگزیر کتاب۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲.۲۵ روپئے سستا ایڈیشن 1 80

اذکارِ مسنونہ

تالیف:- علامہ حافظ ابن قیمؒ

ترجمہ و حواشی:- مولانا خلیل احمد حامدی

- اس کتاب میں آپ کو اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، سفر و حضر، خلوت و جلوت ہر موقع کیلئے مسنون دعائیں ملیں گی۔
- بارگاہِ الٰہی میں مستجاب، جامع، پُراثر اور دل گداز دعاؤں کا مجموعہ۔
- آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت
- قسم اعلیٰ ۴.۰۰ روپئے سستا ۲.۵۰ روپئے

دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی - مولانا امین احسن اصلاحی - میاں طفیل محمد

- دعوتِ اسلامی اور اس کے تقاضے
- مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ
- اقامتِ صلوٰۃ کی غرض و غایت اور اہمیت
- دعوتِ اسلامی میں خواتین کا حصہ
- صفحات ۲۰۰ - آفسٹ کی حسین طباعت
- قیمت ۳.۰۰ روپئے

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- عبادت کا جاہلی اور اسلامی تصور۔
- اسلام میں عبادت کا حقیقی مقام۔
- انسانی زندگی پر عبادات کا اثر۔
- دین کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب
- آفسٹ کی معیاری کتابت و طباعت
- قیمت ۱.۲۵ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور